

# نوادِرِ غالب

ڈاکٹر اکبر حیدری

ادارۂ یادگارِ غالب کراچی

# نوادیرِ غالب

ڈاکٹر اکبر حیدری

ادارۂ یادگارِ غالب

کراچی

سلسلہ مطبوعات ادارہ قیادگار غالب

شمار: ۳۳

طبع اول :	۲۰۰۲ء
صفحات :	۲۶۳
طابع :	احمد یازد، عالم آباد، کراچی
تعداد :	پانچ سو
قیمت :	دو سو روپے

☆

فنی تدوین رفیع احمد نقی

☆

ادارہ قیادگار غالب

پوسٹ بکس نمبر ۲۳۶۸

عالم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰

☆

غالب لاہوری

دوسری چودگی، عالم آباد، حیدر

کراچی ۷۴۶۰۰

## فہرست

۵	حلب اول
۷	نوا اور حلب
۳۲	حلب اور "کوہ حلبہ"
۷۰	کامیج، ہان اور کامیج القامح
۹۸	حلب اور رسالہ "مشرق عالم"
۱۱۵	حلب اور رسالہ "المصر" لکھنو
۱۳۱	حلب اور رسالہ "ادیب" الدہ آباد
۱۶۵	حلب اور رسالہ "معارف"
۱۹۶	مرکز الفت اور ادوہا اخبار



## حرفِ اوّل

اردو کے ادبی تحقیق میں ڈاکٹر اکبر حیدری کا کام بسیار اور مقدار کے اعتبار سے حتمی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ گزشتہ چار دہائیوں سے جس طرح اردو زبان و ادب کے مختلف گوشوں پر دائر تحقیق و سر ہے، اس کی مثالیں کم کم ملتی ہیں۔ ان کی شائع شدہ تصنیفات و مراجعات کی تعداد ساٹھ سے زیادہ ہے اور علمی مقالات پانچ سو کے قریب ہیں۔ ان تصنیفات و مقالات میں جہاں ایک طرف قدیم مصنفین اور سب سے پہلی صدی کے بعض اہم ادبی قلم کی سوانحی قصیدہ نگار اہم کی گئی ہیں، وہیں دوسری طرف ان کے ایسے ادبی آثار کو بھی متعارف کرایا گیا ہے جو عام قاریوں سے اور حاصل ہیں۔ میر خیمبر، میر ظیق، میرزا دیر اور میر انیس کا بہت سا طبع مطلوبہ کام پہلی مرتبہ ڈاکٹر حیدری ہی کی کوششوں سے منظر عام پر آیا ہے۔ میر تقی میر کے دیوانہ اول کا ایک ایسا نسخہ انھوں نے دریافت کیا ہے جس کا متن جدول و بیان کے مقابلے پر مستند اور تعداد اشعار زیادہ ہے۔ اسی طرح بہت سے اہم تصنیفات کی دریافت اور اشاعت سے انھوں نے ہماری ادبی تاریخ کے بہت سے گوشوں کو منور کیا ہے۔

ہر انے اشعار و رسائل بھی ڈاکٹر حیدری کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ ان پر انھوں نے درجنوں مقالے لکھ کر ان کے بارے میں معلومات عام کی ہیں۔ یہی نہیں ان میں شائع شدہ ایسے

نور سابقہ جہد کلمہ لے رہی، ہر دیر حیدرہ (دکن) لے رہی، ہر دیر حیدرہ (پٹی دہلی) لے رہی۔۔۔

بہت سے ادبی نو اور کردار و مشائخ کیا ہے جن سے نفل ادب واقف نہیں تھے۔ ان نو اور کی اشاعت سے اردو کے علمی و ادبی سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

علامہ اقبال پر ڈاکٹر حیدر علی کا کام اس حد تک ہے کہ ان کا شمار ماہرین اقبالیات میں ہوتا ہے۔ ان کی دو کتابیں "اقبال اور صحت زبان" "فوز الکلام اقبال" "نادر و غلابہ د سالوں میں" اب تک کے اقبالیات کے تحقیقی کاموں پر اضافے کا ہر جہد سمجھی ہیں۔

غالب کے حوالے سے ڈاکٹر حیدر علی نے درجنوں مقالات لکھے ہیں جو مختلف علمی جریوں میں پھرتے ہوئے ہیں یا حال فیروز ملوث ہیں۔ ان کی افادیت کے پیش نظر دوبارہ یادگار غالب کی طرف سے ان سے گزارش کی گئی کہ وہ ان مقالات کو کتابی صورت دیکھا کر دیں تو ان سے انتقاد سے کا دائرہ وسیع ہوگا۔ اس گزارش کے جواب میں انھوں نے جو مضامین اور سال فرمائے، انھیں محدود ریل رو ٹیکوں کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے:

(۱) نو اور غالب

(۲) اقبالیات کے چند فراموش شدہ گوشے

ان دونوں ٹیکوں میں حیات و آثار غالب اور معاصرین و حلقین غالب کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں، وہ شاید ہی کسی دوسری جگہ دستیاب ہوں۔ امید ہے ان دونوں کتابوں کی اشاعت سے غالب پر مزید کام کرنے کی راہ ہموار ہوگی۔

## نوادیرِ غالب

(۱) آج سے ۱۳۴ سال قبل اردو کے ایک دل دادہ شفی ہال گویند باقر نے آگرہ سے مارچ ۱۸۶۸ء میں ایک ماہ وار رسالہ ”ذخیرۃ ہال گویند“ کے نام سے اجرا کیا تھا۔ اس کے شمارے پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم اور آپ کے کتب خانے میں موجود تھے۔ یہ شمارے اب لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ پہلا پرچہ مارچ ۱۸۶۸ء اور آخری دسمبر ۱۸۷۰ء کا ہے۔

غالب کے انتقال ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کے کچھ دنوں کے بعد جو پہلا پرچہ مارچ ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا اس میں ایک مضمون غالب کے بارے میں چھپا ہے۔ ریل کا ٹکڑا دلچسپ ہے:

ایک عرصہ ہوا جب یہ نامی شاعر ذریعہ اسلام آباد کر حلیہ فری سن سے آراستہ ہوا تھا۔ ہر چند اس کے اصحاب نے حال اس مذہب نو اختیار کا اور کیفیت فری سن ہوس کی دھوکا دے دے کر بھی دریافت کی، پر اس نے ایک ٹکڑہ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا۔  
یہی کہے گیا کہ کچھ نہ پرچھو۔



مضمون کے آخر میں ایک قطعہ جاری بھی ہے جو اس عنوان کے تحت ہیں

درج ہے:

”قطعہ جاری طبع زاد مولوی محمد حسین صاحب آزاد شاگرد رشید محمد ابراہیم خاں بدوئی، دہلی“

مطلی ہوا پہلوی و دی	اسقط غالب و نو
فرق ہیں نور و پانی پاک	عشق راجی و راجی آفر
حسن کا کبر انکار	علم و نبوت کام نقد سرا
غالب اس شیراز سنی	صوفیوں کا راز و چہ راز
ہمدردی تھا لکھنوی را	اسد کی وہ حجازی زہرا
عصر کی فنی دوست ہے جو	محبوبی وہ راجی سہرا
ہوئی نگر اپنے ملک	فی الحال وہ دہلی سے نو
دوست پر است ہیں زہرا کیں	علم مضمون شامیت آوارہ
نگر ہر آب شد بہ فضل	دل متعلق مکتبہ حد پارہ
از چہ سال راجی آزاد	باجب طبع مکتبہ و زہرا

شعرہ مضمون از خدا سے منظور

کہ بود سال فوستہ نو ”مغفرت“ = ۱۳۹۵ھ

رسالے میں غالب کی فارسی شاعری کو اردو پر ترجیح دی گئی ہے، چنانچہ

متدرج ہے کہ:

”یہ شخص میر دہلی میں ایک بڑا نامی گرامی شاعر فارسی کا تھا۔ اگرچہ اشعار اردو بھی اس کے بہت ہیں، مگر زیادہ تر شہرت فارسی میں حاصل تھی۔“

پروفیسر ادیب مرحوم نے ”تذکرۃ ہل گویند“ کے حوالے سے ”غالب کی وفات پر آزاد کا قطعہ جاری“ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو ”آج کل“ دہلی باب ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا تھا۔ ادیب لکھتے ہیں:

”اس قلمیہ میں کتابت کی کئی غلطیاں تھیں جو درست کردی گئیں۔“

مگر انھوں نے شعر کے دوسرے مصرع میں جو غلطی ہے وہ بھری  
مجھ میں نہیں آئی۔ اس لیے مصرع ”جسبہ نقل کیا گیا۔“

جب ادیب کا مضمون قاری اور عربی کے نامور استاد پروفیسر عبدالستار صدیقی  
ان آباد یونیورسٹی کی فکر سے گزرا تو انھوں نے لفظ ”شامت“ کے بارے میں ”آج  
کل“ دہلی ہفت ۱۵ مارچ ۱۹۴۷ء (صفحہ ۲۶) میں یوں اظہار خیال کیا:

جیسا کہ سید صاحب (مسعود حسن رضوی) نے فرمایا یہ مصرع مجھ  
میں نہیں آتا۔ ”عظیم مضمون“ ”شامت آلودہ“ ”شامت“ کا ہر کاتب  
کی غلطی ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ ”شامت“ اصل میں ہوگا۔  
کاتب نہ پڑھ سکا اور اس کی تصحیف کی صورت پیدا ہوگئی۔  
”آلودہ“ میں یہ شبہ نہیں ہوتا۔ ”عظیم مضمون“ شدہ ست آلودہ۔  
مضمون کا نظم جاتا رہا، جاہ ہو گیا، اب مارا مارا پھرتا ہے۔ ”آلودہ“  
کے یہ تخیل سستی ہیں۔

آزاد کے زیرِ نظر قلمی تاریخ میں لفظ ”شامت“ اس قدر دلچسپی کا باعث ہو گیا  
تھا کہ ڈاکٹر آغا محمد باقر صاحب نے بھی ایک مضمون بعنوان ”آزاد کا قلمی تاریخ“  
لکھا۔ جو ”آج کل“ دہلی کی ۱۵ اپریل ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ وہ  
لکھتے ہیں:

”آج کل“ کی ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں مسعود حسن  
صاحب رضوی نے غالب کی دہلیات پر مولانا آزاد مرحوم کا لکھا ہوا  
قلمی تاریخ شائع کیا ہے، جس میں انھوں نے شعر یوں درج ہے:  
دھت پرست چو نہ دار کھن عظیم مضمون شامت آلودہ  
نوبلی ٹوٹ میں رضوی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ ”اس قلمی  
میں۔ ”جسبہ نقل کر دیا گیا۔“

حقیقت یہ ہے کہ اس مصرع میں کتاب کی کوئی غلطی نہیں۔ صرف طرزِ تحریر

ٹانوس ہونے کی وجہ سے دوسرا مصرع پڑھا نہیں گیا اور اگر اس مصرع پر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ مصرع ہیں پڑھا جانا چاہیے تھا۔

علمِ مضمونِ شائستہ آورہ

یعنی ”میں کے مضمون کا حکم پریشان ہو گیا ہے۔“ قلمیے کے نویں اور دسویں شعر سے ظاہر ہے کہ ضمیرِ متصل کا، جو ”مضمونِ شائستہ“ میں رکھا گیا ہے، وہی ترتیب ان اشعار میں ”فعلش“ اور ”مصلحتش“ کی ترکیب میں دہرائی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:

بکرِ بحر آب شد بہ فعلش      دلِ تفتیش گشت صد بارہ

از پے سالِ مصلحتش آزار      بہتِ فیہ گشت و زدِ لغو

”شائستہ“ کو ”شده است“ پڑھنے سے بھی ربطِ مضمون قائم رہے گا اور تفتیش

میں فرق نہ آئے گا۔ ملاحظہ ہو:

دشتِ برست چوں ز دہر کہن      علمِ مضمونِ شده است آورہ

لیکن اصلی تحریر میں ”شائستہ“ کو پیشِ نظر رکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ قیاس

درست نہیں۔ ”شائستہ“ کی کوئی شکل بھی ”شده است“ نہیں بن سکتی۔ اس لیے صحیح

صرف یہ ہے۔

(۲) جناب سید علی ہاشم عظیم آبادی ایکم صاحبِ طرزِ ادیب تھے۔ ان کے مضامین

حضرت مولائی کے مرتب کردہ رسالے ”اردوئے معلّے“ (علی گڑھ) اور شیخ عبدالقادر

کے ”غزنو“ (لاہور) کے ابتدائی شماروں میں بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتے

تھے۔ راقمِ حروف نے ان کے چند مضامین دیکر رسالوں میں بھی دیکھے ہیں۔ ہاشم

صاحب ”اردوئے معلّے“ جلد ۳، نمبر ۴ (صفحہ ۲۸) اپریل ۱۹۰۳ء میں لکھتے ہیں کہ:

شہرِ عظیم آبادی کی عمر بارہ ہجری ہجری کی تھی۔ انھوں نے لفظ

”گیت“ کے ذکر و بحث ہونے میں یہاں کے بعض حضرات

سے گفتگو کی۔ فریقِ مخالف اس لفظ کے ذکر ہونے کو نہ مانتے

تھے تو شاید نے ایک خط مرزا دہر مرحوم کی خدمت میں تحریر کیا۔ جب کئی ہفتے تک کوئی جواب نہ آیا تو ایک مظلوم خط جناب مرزا اسد اللہ خاں غالب منظور کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت غالب نے اس نظم کو بہت پسند کر کے جو جواب لکھا وہ اس زمانے میں دست بدست پھرا کیا اور لوگوں کو دہانی یاد ہو گیا۔ غالب کے خط پڑا کی نقل سید احمد منظور (دلیو ہاشم عظیم آبادی) نے اسی زمانے میں اپنی کتاب پر لکھ رکھی تھی۔ یہ خط دہلی میں دیا گیا جاتا ہے:

”اورنگ نصیبی فصاحت و سادہ بلاغت سلام۔  
 نظم دل پسند یا تم و بر سنی و سنی وقار گرامی عشق عشق ہا نظم۔ ایچک  
 لفظ ”مکت“ بر دہلی صیت معمول ہندوستان ما ازیں گم کرد  
 راہ حقیقت حقیقت فرمودی۔ نہ آں چاہست کہ دریں میر کوش  
 اسد اللہ مرزا دہر سلمہ اللہ اللہ ہا آں نہ گرایہ... دلیجان  
 ایں جا مذکرت خواستہ۔ دیار عشق  
 خاک پاے اسد اللہ، غالب مظلوم

(۳) سید کاظم علی شوکت بکری (متوفی ۱۹۴۳ء) ۱۵۰۰ء صدی کے لوگوں میں کل دہلیوں اور دیگر دہلیوں میں تھے۔ فنی شاعری میں امیر جہانی (متوفی ۱۹۰۰ء) کے نامی شاگردوں میں تھے۔ شوکت کے حقیقی اور تخیلی مضامین ”اردوے معنی“ علی گڑھ میں میری فکر سے گزرے ہیں۔ ایک مضمون ”غالب کا ایک شعر“ کے عنوان سے ”اردوے معنی“ (جلد ۱۲) میں چھپا تھا۔ مضمون کا آغاز یوں ہوتا ہے:

یاد رہے مگر ایں جا یاد زباں دالے  
 لربہ شعر مضمونے گفتنی دارد

اس شعر میں زبانِ دان سے ان کی غرض رازِ راز سے ہے، یعنی زبانِ دان تو بہت ہیں، مگر کوئی ایسا غنی فہم بھی ہے جو میری باتوں سے میرا مٹا مٹا کرے اور اس سے متاثر ہو۔ اس طوار سے غرض یہ ہے کہ شعر کی معنوی خوبی کا سمجھنا حقیقت میں نہایت دشوار ہے اور پھر شعر بھی غالب کا شعر جس کے حلقوں وہ خود فرماتے ہیں کہ:

گر خاشی سے فائدہ اٹھائے حال ہے

غوش ہوں کہ میری بات سمجھتی حال ہے

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں مجھے ایک واقعہ یاد آگیا جو میرے ایک بزرگ نے مجھ سے بیان فرمایا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ایک واقعہ میں سچ چند اصحابِ دہلی میں مرزا غالب کی ملاقات کو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مرزا قوتِ طاقت سے بے بہرہ ہو چکے تھے۔ دولتِ ظہر ہر وقت سامنے دکھاتا رہتا تھا اور جو ملاقاتی آتے تھے وہ اپنا منہ مانا کھانہ کھا کر بیٹھ جاتے تھے، چنانچہ جس وقت ہم لوگ ان کی خدمت میں پہنچے تو حسبِ عادت انھوں نے دولتِ ظہر، کاند آگے بڑھا دیا اور فرمایا، ارشاد میں نے لکھا کہ ہم لوگ آپ کا کلام بلاغتِ کلام آپ کی زبانِ فیضِ ترجمان سے سننا چاہتے ہیں۔ یہ دیکھ کر فرمایا، بہت اچھا اور اس کے بعد یہ فرمایا:

ہم سے باز آئے پر باز آئیں کیا

کہتے ہیں، ہم تھ کو منہ دکھائیں کیا

اور حسبِ یہ مطلع پڑھا:

پہنچتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے

کوئی اطلاع کہ ہم اطلاعیں کیا

تو فرمایا، کہہ، کہہ کہے بھی! ہم نے (اس خیال سے کہ ہم جو کہے ہیں اگر وہ ان کا غلط نہ ہو تو کہہ بیٹھیں گے) عرض کیا، ”مطلق نہیں کہے!“ اس پر مسکرا کر فرمایا، ”نہیں کہے ہو گے۔ سنو ایک زمانہ ہوا جب وہاں گئے تھے، جانتے ہو، کہاں؟“ عرض کیا، ”نہیں!“ کہتے گئے، اسی ادب میں اپنے مستحق کے پاس، مگر یہ اس زمانے کا ذکر ہے

ہب بچتے تھے، یعنی جہاں تھے، سر پہ ہال تھے، ٹھنسی ہوئی ڈالسی تھی، تاکا ہوا سینہ تھا،  
 بھرے بھرے بازو تھے، چھپی رنگ تھا، نگاہ اٹھا کر دیکھتے تھے تو آنکھوں سے شیلے نکلتے  
 تھے، چلتے تھے تو درد و دیوار ملتے تھے، اس وقت کے مجھے، ہر کب مجھے؟ اب ہب کہ  
 آنکھوں میں نور، دل میں سرور نہ رہا، رنگ کافور ہو گیا، منہ پر تھریاں پڑ گئیں، کر  
 بنک گئی، اٹھتے ہیں تو تھڑے تھڑے ہوتے، چلتے ہیں تو ٹوٹکڑاتے ہوئے، زانہوں کی  
 طرح سرسٹھا ڈالا، ڈالسی بڑھادی۔ اب ہم کو اس صفت کدائی میں دیکھ کر:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے  
 کوئی تھلاؤ کہ ہم بتائیں کیا

## (۴) غالب کا ایک شعر

شوکت بگلرانی صاحب اس شعر کے بارے میں ”مردے مٹے“ نمبر ۹، جلد ۱۱  
 (صفحہ ۱۳) بابت جنوری ۱۹۱۰ء میں لکھتے ہیں:

اکثر دیکھا گیا کہ وقت پسند طالع مضمون کی تلاش میں کہوں کل  
 جاتے ہیں اور سامنے کی باتیں ان کو نہیں سنبھلتیں۔ اگرچہ دیکھا  
 جائے تو دل نہیں دہن باتیں ہوتی ہیں جو دن رات ہم پر گزرتی  
 ہیں اور یہی شعر کی اصل غایت ہے کہ وہ دل نہیں ہو، چٹاں چہ  
 قدر مرعوم کہتے ہیں:

ہم تو اسی شعر کو کہتے ہیں شعر  
 منہ سے وہ نکلا کہ اثر ہو گیا

یہ بات (یعنی کلام میں اثر) یا تو شعراے حقیقی کے کلام میں  
 دیکھی گئی ہے یا دور آخر کے سرعاج مرزا غالب کے کلام میں پائی  
 جاتی ہے اور یہی خصوصیت ہے جس نے ان کے کلام کو ادبوں

سے ممتاز نکلا ہے، چنانچہ ان کا مکتوبہ دلیان ہمارے اس  
دوسرے کا شلوہ مطلق ہے۔ مرزا کی ایک مشہور غزل ہے:

قیس قصور کے پردے میں بھی عریاں نکلا

بعد طبع دیوان اسی زمین میں مرزا نے ایک اور شعر کہا تھا، جو میں  
نے اپنے ایک بزرگ سے سنا ہے، چوں کہ یہ شعر دیوان میں نہیں  
ہے اس لیے نذر ناظرین کرتا ہوں۔ دیکھیے غالب مرحوم نے اپنی  
انجانی حسن پرستی اور انجانی بے سرو سامانی کو کس انداز سے بیان  
کیا ہے اور خوب کہا ہے:

چند قصور بتاں، چند حسینوں کے غلطو

بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ سماں نکلا

یہ شعر ”دیوان غالب مع شرح نکاتی“ مکتوبہ نکاتی پریس دہلی (۱۹۲۳ء)

کے سطرانہ میں بھی موجود ہے، مرثیہ کلام الدین حسین شعر کے مانچے میں لکھتے ہیں کہ:

یہ شعر اکثر لوگوں کی زبان پر ہے، لیکن اس کے اصلی مصنف کے

نام سے لوگ نا آشنا ہیں۔ بعض اسے میر تقی میر کا شعر بتاتے ہیں،

بعض مرزا غالب کا۔ لیکن کلیات میر میں اس کا پتا نہیں، نہ

دیوان غالب میں ہے۔ لیکن حضرت شوکت بکرائی نے اس شعر

کی بات ”اردو سے مغلے“ علی گڑھ مکتوبہ حیدر ۱۹۱۰ء میں اپنے ایک

بزرگ کے حوالے سے لکھا تھا کہ اپنی اس مشہور غزل ”قیس قصور

کے پردے میں بھی عریاں نکلا“ میں ابو طبع دیوان مرزا نے اس

شعر کا اضافہ کیا تھا، اب نہیں کہ حضرت شوکت کا یہ بیان گج ہوں،

کیوں کہ اس شعر کے تہجد بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ وہ مرزا جیسے

قادر الکلام شاعر کے کام سے نکلا ہے۔

غالب کا یہ شعر ”دیوان غالب“ تاج ایلمن، تاج کتبھی لیٹڈ، لاہور میں بھی

صفحہ ۳۱۲ میں موجود ہے، لیکن راقم کو ادبِ غالب کے کسی مستند نسخے میں یہ شعر نہیں نظر نہیں آیا۔

## (۵) غالب اور ”حلو سوہن“

غالب کی بیوی نے اپنے بھائی دین العابدین خاں تھکس مارت (متوفی ۱۸۵۲ء) کو اپنا مہر ملا بیٹا بھالیا تھا اور غالب نے ان کے بیٹے باقر علی خاں کی شادی اپنی آخری عمر میں بچے حکیم (نور الدین علی خاں مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند کی نانی) سے کی تھی۔ ”آج کل“ دہلی (صفحہ ۱۶) باب ۱۵ فروری ۱۹۳۷ء میں حمید احمد خاں کا ایک مضمون ”غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک“ شائع ہوا۔ خاں صاحب نے اس میں غالب کے حلقے بچے حکیم کے حوالے بھی دیے ہیں، ملاحظہ فرماتے ہیں:

غالب ایک وقت کھانا کھاتے تھے۔ دوسرے وقت کباب کتے ہوئے، دال، مویہ، پیسے ہوتے پادام، اور حلو سوہن۔

جب خاں صاحب کا مضمون ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کی نظر سے گزرا تو انہوں نے اپنے پیر صاحب ”آج کل“ کو ایک خط لکھا جو ”آج کل“ دہلی (ص ۳۶) باب ۱۵ مارچ ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے چند جملے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

اور چیزوں کا ذکر تو غالب نے اپنے غزلوں میں خود ہی کیا ہے۔ مگر ”حلو سوہن“ ان کے غزلوں میں اس حلقے میں نہیں ملتا۔ جس زمانے میں بچے حکیم نے انہیں دیکھا ہے اس سے بہت پہلے مرزا صاحب کے ماتحت جواب دے چکے تھے اور اسی لیے ڈاکٹر بھی چھوڑ دی تھی، سنی بھی۔ روزانہ تو حلو سوہن کیا ہی کھاتے ہوں گے، بچے حکیم نے حلو سوہن شاید شراب کی جگہ لکھ دیا۔ فارسی میں ایک لفظ ”سوہن“ ہے۔ مگر وہ مختلف ہے ”سوہن“ کا۔



”سوہاں“ رتی کو کہتے ہیں یا سنگ ”لسان“ کو۔ رتی وہ بھاری  
ہے جسے لوہار کسی سخت چیز پر رگڑتا ہے۔ ظاہر ہے ”رتی“ یا  
”لسان“ کو نہ طوے سے کوئی مٹا بہت ذہن شرب سے۔ مگر غالب  
کے ایک قاری شعر میں ”سوہاں“ شراب کے لیے آیا:

مکلفش سلسیل خوش ہاشد  
گفت خوشتر ہاشد از سوہاں

ڈاکٹر صاحب نے شعر میں ”سوہاں“ کے معنی شراب ہی بیان کیے  
ہیں اور مزید وضاحت کرتے ہیں کہ:

”بہی میں ایک لفظ ”سوہاں“ ہے۔ اس کے معنی ہیں جی کو  
بھانے (بھلا گئے) والا“ گورا، خوش نما، خوب صورت۔ ”سوہاں“  
مٹائی کو بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ ”سوہاں طو“ قرینہ ہے کہ غالب  
نے ”تاب گورا“ کے لیے استعمال کیا ہے۔

اردو کے نامور شاعر مرزا یاس بکاتہ پنجگیزی نے ایک مختصر مگر دلچسپ مضمون  
”لفظ سوہاں کی تحقیق“ لکھا جو ”آج کل“ دہلی (جلد ۳۰-۳۱) ہمارے جولائی ۱۹۴۷ء  
میں شائع ہوا۔ بکاتہ نے ابتدا میں غالب کا ایک قصیدہ درج کیا۔ چند شعر یہ ہیں:

ساقی بزم آگئی روزے راتے راتے در بیکار من  
چوں دایم رسید زہں صہبا شدم از درکار و ہم اکین  
مکلفش سوسخت نازم مطرم گفت جہد و بجائے اہل وطن  
مکلفش چوں بد عظیم آباد گفت رنجیں تر از فضاے ہمین  
مکلفش سلسیل خوش ہاشد گفت خوشتر ہاشد از سوہاں  
حال نکلتہ ہاز جہنم گفت  
ہاز عظیم مکلفش

اس کے بعد اس پکارت نکلتے ہیں کہ:

یہ قلعہ غالب کی فکر رکھیں گا ایک صوف ہے جس میں مرزا صاحب نے ساقی کو غائب کر کے ایک حقارے کی صورت میں سلجھکھڑا اور خائے سحر کے بعض تاثرات کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے ثابت ہے کہ دہلی سے نکلتے جا رہے تھے تو درمیان میں جاس اور عظیم آباد میں بھی ٹھہرے تھے۔

رسالہ ”آج کل“ ۱۵ فروری اور ۱۵ مارچ ۱۹۳۷ء میں غالب کی نسبت بعض اقوال نقل کر کے یاروں نے اپنی اپنی خیال آرائیوں کے تحت کچھ لکھی ہے رہا باتیں پھیل رہی ہیں کہ کیا کہوں۔ حمید علیہ خاں صاحب نے فٹ نوٹ میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مرزا کھانا ایک وقت کھاتے تھے۔ دوسرے وقت کباب تھے ہونے اور سوہن حلوا۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اپنے مکتوب مندرجہ ”آج کل“ مارچ ۱۵ مارچ ۱۹۳۷ء میں لکھتے ہیں:

حمید احمد خاں صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بنگا نیگم نے حلوا سوہن شاید شراب کی جگہ دیا۔ مسلمان گھروں کی بیویاں اپنے لختوں کا منہ سے نکالنا معیوب ہوتی ہیں۔ کبھی کالا پانی کہہ دیا۔ کبھی دوا۔ بنگا نیگم صاحب نے اگر ڈاکٹر صاحب پر دلا تو کہا تھا۔ لیجئے، ڈاکٹر صاحب کا خیال بھی یہ کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا بنگا نیگم صاحب نے شراب پر گاڑا پردہ ڈالنے کی غرض سے شراب کی جگہ حلوا سوہن لکھ دیا۔ نیگم صاحب نے شراب کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔ یہاں حلوا سوہن وہی کھانے کی چیز ہے۔ اسے شراب کا پردہ یا گاڑا پردہ سمجھنا محض بے رہا ہمت ہے۔ کیا حلوا سوہن، کھا شراب، چہ نسبت؟

پھر یاس ڈاکٹر صاحب کے بیان کو دہراتے ہیں کہ:  
 قاری میں ایک لفظ سوہن ہے۔ مگر وہ تلفظ ہے ”سوہان“ کا بمعنی  
 ریتی۔ وہ آکر جس سے کسی سخت چیز کو رگڑ کر ہموار کرتے ہیں۔  
 ظاہر ہے کہ ریتی کو نہ علوسے سے کوئی مناسبت ہے نہ شراب  
 سے۔ مگر غالب کے ایک شعر میں شراب کے لیے آیا ہے:  
 کشفش سلسیل خوش باشد  
 گشت خوشتر نہ باشد از سوہن

اس بحث کے بعد یاس پکارتے ہیں کہ فیصل سناتے ہیں جو بالکل درست ہے:  
 اہل مدرہ کی محفل مصدی ری حلق پر۔ پہلے تو ڈاکٹر صاحب سے  
 یہ پوچھنا چاہیے کہ آپ کا ”تاب گوارا“ کیا چیز ہے۔ قاری ادب  
 میں تو ”آب گوارا“ کا کوئی وجود نہیں۔ لفظ ”تاب“ ام نہیں ہے،  
 صفت ہے۔ جس کے معنی ہیں صاف اور خالص۔ جیسے ”مئے  
 تاب“، ”ادۂ تاب“ یعنی ایسی شراب جو صاف ہو، خالص ہو،  
 بے فتن ہو، جس میں کوئی آمیزش نہ ہو۔ ”تاب گوارا“ محض  
 بے معنی ترکیب ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ شاید  
 اہل مدرہ ”سوہن“ کے قافیہ کو بھڑا اٹھرائیں گے، مگر اس میں تو  
 کوئی بھڑاہٹ نہیں ہے۔ ”سوہن“ کا قافیہ بھی دیا ہی ہے جیسے  
 غالب کے اسی قلمے میں ”لعدن“ کا قافیہ ہے:

مکفتم ایں لہ بکریں چہ کس اند  
 گشت خروان کشور لعدن

ڈاکٹر صاحب پھر فرماتے ہیں:

تکلیفِ سوہن (شراب کے معنی میں) دلی دالوں کی اصطلاح تھی  
 اور شاید اب بھی ہے۔ چہ خوشا یہ ”شاید“ کیا؟ اور اصطلاح

کیا؟ اصطلاح تو وہ ہے جو کم از کم کسی طبقے یا کسی جماعت میں رائج ہو، مگر کیا ثبوت ہے اس امر کا کہ ”سویں“ بمعنی شراب دہلی والوں کی اصطلاح تھی یا ہے؟

ڈاکٹر صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ:

بگ صاحب کا اسے بے تکلف استعمال کرنا خود ہی سند ہے۔

اس جملے سے پاس پکارتہ خیال میں آکر نکلتے ہیں:

لیجیے، خواہ لخواہ کی سند بھی گویا ہاتھ آگئی۔ ڈاکٹر صاحب کس ہوا پر اڑے جا رہے ہیں۔ خیال کی گم راہی کوھر سے کوھر لے جا رہی ہے۔ بے چارہ بگ تنگم پر یہ محض اتہام ہے۔ تنگم صاحب نے ہرگز لفظ ”سویں“ شراب کے معنی میں استعمال نہیں کیا، نہ غالب نے۔ بغرض محال بگ صاحب نے ایسا کیا بھی ہوتا تو شراب کے حلقے ایک صورتِ اامت کا قول سند نہیں ہوتا۔ ہاں، کوئی شرابی ان معنوں میں کہتا تو اس کا یہ فعل ایک شخصِ تعریف ہوتا، مگر اصطلاح ہرگز نہ ہوتی۔ یہ سب باوجود ہوائی باتیں ہیں، جنہیں غالب کے شعر سے اور تنگم صاحب کے مذکورہ بالا قول سے کوئی دبا نہیں۔

مذکورہ مصدر کی روشنی میں حلیہ حال تو یہ ہے کہ غالب دہلی سے نکلتے جاتے ہوئے دہلیس اور عظیم آباد میں ٹھہرے تھے۔ عظیم آباد کے قریب پہلچے ہوں گے جس کا پانی سطیحیل تو کیا چیز ہے، گنگا سے بھی زیادہ صاف اور صحت بخش ہے۔ اسی آبِ صاف کی بنا پر وہاں کے لوگ دریائے سویں کو ”سویں بھدرا“ بھی کہتے ہیں۔ عظیم آباد کے بعض رؤساء نے گنگا کے کنارے رہنے کے باوجود اس زمانے میں جب کہ ریل نہ تھی خاص اجتماع کے ساتھ سویں کا پانی لیا ہوگا، جسے وہ ساتھی کی زبان سے آبِ سطیحیل پر ترجیح دیتے ہیں۔ سویں بمعنی شراب نہ غالب کے شعر سے ثابت ہے نہ

بچے حکیم کے حلواموہن سے۔“

(۶) اس وقت میرے پاس ”عمود ہندی“ کے دو ایڈیشن ہیں۔ ایک پہلا جو مطبع پنجابی میں ستمبر ۱۸۹۸ء میں سرٹھ میں ممتاز علی خاں کیا اجرام سے چھپا تھا اور دوسرا جو مطبع لکھنؤ کان پور میں مئی ۱۸۸۷ء میں چھپا تھا۔ فنی ہنگوین دیال مجلس مائل نے تاریخ مطبع کہی۔

عمود ہندی ست طرفہ افکائی غالب از بس ڈر معانی سفت سال تاریخ مطبع او مائل چہ جب رقاصہ غالب گفت ”عمود ہندی“ کے بعد مرزا غالب کے خطوط کا دوسرا مجموعہ مولانا حالی کی نگرانی میں ۱۸۹۹ء میں پہلی مطبع پنجابی دہلی میں میر مہدی محمود (ستوری ۱۹۰۲ء) کے دیواسے کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ یہ بھی میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کا نام ”اردوئے معلّے“ ہے۔ ان دونوں مجموعوں کے بعد خطوط غالب کے محدّد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں تبر (غلام رسول) کے ”خطوط غالب“ (مطبع عالم ۱۹۸۲ء) اور ڈاکٹر خلیق انجم کے ”غالب کے خطوط“ (مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۱۹۸۷ء) کی تین جلدیں (پہلی، دوسری، تیسری) سامنے ہیں۔ ذیل میں غالب کے وہ خطوط تھیں کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں جو غالب خطوط غالب کے ابتدائی مجموعوں میں نہیں ملتے ہیں۔ کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جو تبر اور ڈاکٹر موصوف وغیرہ کے مرثب کردہ مجموعوں میں نہیں ملتے ہیں۔ تفصیلات درج ذیل ہیں:

دہلی نگرانی اردو کے مشہور شاعر صاحب طرز افکا ہنداز اور صحافی تھے انھوں نے جنوری ۱۹۲۶ء میں لکھنؤ سے ایک ادبی رسالہ ”مرقح“ کے نام سے جاری کیا تھا۔ اس کے محدّد شمارے کتب خانہ فیملی نورانی لکھنؤ میں موجود ہیں۔ ”مرقح“ کے سرورق پر اقبال کا ایک شعر ہوتا تھا جو علامہ نے ”مرقح“ ہی کے لیے تصنیف کیا تھا۔ تفصیلات کے لیے رالم کا مضمون ”نورادراستہ بنگال“، ”شاعر“، ”بھتی“ کے ”اقبال فہر“ (صفحہ ۳۷) مطبوعہ ۱۹۸۸ء دیکھا جاسکتا ہے۔

”مرقع“ لکھو، بابت بخوری ۱۹۳۶ء میں غالب کے دو خط، شائع ہوئے جو ”عمود ہندی“ یا ”اردوے معلّے“ میں نہیں ہیں۔ دوسرا خط، جو نواب انوار الدولہ شخص شفیق کے نام ہے، ”مرقع“ کے بعد ڈاکٹر مہدالحق نے ”اردو“ مورنگ آوار، بابت بخوری ۱۹۳۳ء (صفحہ ۱۹۳-۱۹۵) میں بطور حوالے کے شائع کیا۔ یہاں سے ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی کتاب ”غالب کی نادر تحریریں“ میں شامل کیا۔ اس کے بعد موصوف نے غلام اسے حافظہ کی عدم دستیابی کی بنا پر خطوط غالب سے خارج کیا۔ اس بارے میں راقم نے ڈاکٹر صاحب کو رجسٹری شدہ خط لکھ کر دریافت کرنا چاہا تھا کہ یہ خط شامل کتاب کیوں نہیں کیا گیا۔ انھوں نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ مرنے سے یہ خط بطور کسی حوالے کے صفحہ ۲۹۳ میں بار ختم ۱۹۸۲ء میں شامل کیا۔

”مرقع“ لکھو میں دونوں خطوں کے حوالے اس طرح درج ہیں:

- (۱) ”نکری۔ جناب مولوی ابوالحسن یحییٰ جناب مولانا مہدالحق صاحب حقانی مرحوم دہلوی نے مجھے حمایت فرمائی۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ خط کس کے نام ہے اور اس میں جس رہائی کا ذکر ہے وہ رہائی بھی نہ مل سکی۔ بہر حال، یہ تحریر حضرت غالب مرحوم کی ہے جو ایک یادگار چیز ہے۔“
- (۲) ”حضرت غالب مرحوم نے اپنے شاگرد جناب انوار الدولہ سعید الدین خان بہادر سحاش دار ریاست کدوا شخص پہ شفیق کے نام تحریر فرمایا ہے۔ یہ خط جناب نواب شفیق بہادر کے صاحب زادے جناب نواب سعید الدولہ محمد علی الدین خان بہادر سے جناب سید احمد حسن صاحب بن سید شاہ قطب اعظم مرحوم ساکن وگزارہ دار ریاست ہانڈی کدوا کو ملا اور اب میں نے اس کو نکری جناب سید شریف احسن صاحب صاحب کٹوری سے لے کر نکس لیا۔ ایڈیٹر“

## خط نمبر ۱

بندہ بہادر آج میں نے دو انگریزی عرضی روانہ کردی اور صبح کو

آپ کا کہار مسودہ اور میرے صحن کا رتھ آپ کے نام مجھ کو  
دے گیا۔ ۱۲

اس عتابت کے شکر میں کیا خدمت بجا آتا۔ ہارے ایک رہائی بھیجتا ہوں۔  
اس کو آپ پڑھ کر اور لطف اٹھا کر راجا صاحب کی خدمت میں بھجوا دیجیے۔ ۱۳  
امید یہ تھی کہ نیم و تحفیم نیم دونوں طرح مستعمل ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جناب  
ممدوح اس کو زحاف سمجھیں۔ پہلے اور دوسرے مصرع میں یہ تحفیم نیم ہے اور تیسرے  
مصرع کا نیم مشدد ہے۔ ۱۴۔ غالب۔ ۱۵  
دوسرا خط شفق کے نام اصلاحی ہے۔ اس میں گرامر اور تذکیر و تانیث کا ذکر کیا  
گیا ہے۔ کتاب میں ہرے خط کا عکس دیا گیا ہے، یہاں آخری خطے درج کیے  
جاتے ہیں:

خداوند، آئینی بندہ پروردی ہے۔ بھول نہ جاؤ، گاہ گاہ نامہ و پیام  
بھیجتے رہوں۔ کیا میں نہیں لکھ سکتا کہ میں نے اس سرے میں دو خط  
بھیجے اور آپ نے ایک کا جواب نہیں لکھا۔ ہاں، یہ عرض کرتا ہوں  
کہ آج صبح کو آپ کا خط آیا۔ ادھر پڑھا اور لکھا۔ سچ یوں ہے  
کہ ڈاک میں اکثر غلطیوں کا ہوتا ہے۔ ہر گز پر ضائع ہونے  
کا گمان کم ہے۔ اس دستور کا ہادی اور بانی میں ہوتا ہوں۔ یہ خط  
ہر گز بھیجتا ہوں۔ آپ بھی اب جب کبھی بغرض حال خط بھیجے تو  
ہر گز مجھے۔ زیادہ سہ ادب۔

مرضداشت غالب، نکاح شہید چہار شنبہ سوم شعبان و نیم مارچ،  
سال ۱۳۔

(۷) مرزا غالب غلامانی نواب تھے، لیکن ہمیشہ معاشی بدعالی میں جکڑے رہے تھے۔  
انرا بہت زیادہ اور آمدنی تھیں۔ مطلق اور مجبوری کے عالم میں مالی امداد کے لیے

# حضرت غالب مرحوم کے دو خطوں کا خاکہ

— ۱۱۵۳ —

خط نمبر (۱) مری جناب مولوی ابوالحسن صاحب دین جناب علامہ عبدالحق صاحب خاں مرحوم دہری  
نے ایک عنایت فرمائی۔ خیر معلوم ہو گا کہ یہ خط کس کے نام ہے اور میں جس نامی کا ذکر  
وہ نام بھی بدل کی۔ بہر حال یہ غرض حضرت غالب مرحوم کے نام کی ہے جو کہ سب کا خیر ہے  
خط نمبر (۲) حضرت غالب مرحوم نے اپنے شاگرد جناب بابر اللہ اللہ صاحب دین خاں مرحوم سے دریافت کیا  
تفصیل چنانچہ کے نام تحریر فرمایا ہے۔

یہ خط جناب بابر صاحب کے صاحبزادے جناب ابوسعید اللہ مرحوم دین خاں صاحب جناب بابر  
مرحوم صاحب دین سے منسوب ہے۔ غرض کہ وہ صاحبزادے اپنے والد کے نام سے خط لکھا۔ صاحب  
مرحوم سے لکھ کر مری جناب تہذیب و تمدن خاں صاحب تہذیب لکھ کر بھیج دیا۔ اور پھر

## خط نمبر ۱

ہندو پر در تاج چننا وہ گھوڑ پر منی رمانہ کوئی ہوش  
آج کے کبار سونامہ میر حسن کا رقصہ بیکہ نام  
بیکہ فرمایا

اس عنایت کی شکر میں کیا خدمت بجا لاؤں  
ایکے بابر چہ تائید اس کو آب و ہوا اور طبع  
ادب کا راجہ تہذیب کے قد متین بہر ادب

آئید جہشہ یہ ہم و تخفیف ہم و نون طرح مستعمل  
ایسا ہندو جناب ہندو ہندو ہندو ہندو ہندو  
دوسرے صبح میں یہ تخفیف ہم و نون طرح مستعمل  
کامیاب شدہ دہلی ۱۲ غالب



تجارت

[illegible]

لوگوں کی قہر نہیں کیا کرتے تھے۔ اس قسم کی لاپرواہی اور محک و قتی فن کی خودداری کو ذک پہنچاتی تھی۔ بخش کی داگراری دغیرہ کے لیے انھیں کیا کیا پانچ پٹے پڑے۔ وہ کسی سے قتی نہیں۔ ان کے ایک دوست قتی کشوری لال تھے۔ انھوں نے راجا بیکار سردار سنگھ (موتی ۱۸۷۲ء) سے مشورہ کر کے غالب سے پتے کے لیے سوا سے مربع کرائے۔ اس کے عوض غالب کو ایک ہزار روپہ ملا تھا۔ غالب نے اپنے خط میں قندرف کے طور پر مہاراجا کو یہ بھی لکھا تھا کہ:

یہ گوشہ فطیں سرکار فیض آچار انگریزی کا بیوض بخش دہر اور  
گورنمنٹ کے دربار میں سات پارچے اور تین رقم خلعت پانے  
والا اور حضرت قدر قدس ملکہ معظمہ دوداں کا مذاج اور فطلم  
درداے شاہنشاہی سادتی لکھت غرضتودی کا پانے ہوئے ہوں۔  
خط کے آخری الفاظ یہ ہیں:

اب نیازمند اس محتات کا حوق ہے کہ آئندہ میں راج کا محتول  
اور سری مہاراج کا دولت خواہ اور دعا گو نکا چاڑی گا اور جو کام  
میرے لائق ہو۔ ہے ظلف اس کے سرانجام کا مجھ کو علم ہوا  
کرے۔ زیادہ اوب۔ بہارستان چاہ و جلال ہے نزان و  
بہار دولت و اقبال چادواں ہار۔ نیازمند۔ اسد اللہ غالب۔

خط کے آخر میں ”بم ۱۸۵۹ء“ کی تاریخ ثبت ہے۔ اس کے ساتھ  
غالب کی سر بھی چہاں ہے۔ یہ خط اطہر پاڑی کی دریافت ہے۔ اس کا کس سب سے  
پہلے ”آج کل“ دلی بابت ۱۵ جنوری ۱۹۳۷ء کی اشاعت میں دھلرنی روشنی سے شائع  
ہوا تھا۔ پھر اسے ڈاکٹر ظیق اہم نے تحفیف کر کے ”غالب کے خطوط“ جلد دوم (صفحہ  
۹۵۶) میں شامل کیا۔ کس اتکا ہر یک ہے کہ پڑھا نہیں جاسکا۔ ہم نے ”آج کل“  
دلی سے اتھ کر کے اس کا فوٹو لیا۔ مرنے یہ خط بغیر کسی حوالے کے ”خطوط غالب“  
(صفحہ ۵۳۷ ہار بم) میں شامل کیا۔ موصوف نے غالب کی مر کے بعد کی تقریر درج



نہیں کی۔ نگہ میں اس طرح موجود ہے:

(مجلیٰ حروف میں:) ”اُن سب میں جوں سا آپ کے نزدیک موزوں اور فصیح ہو، اُس پر صواب کر دیجیے۔“

دکنور ہے	ہند و انگلیٹ	د انگلیٹ	ہندو کے صواب
ملکِ زمانِ کون	تختِ نشین	اورنگ آرائے ہند	ہندو کے صواب
سرے آرائے ہند و انگلیٹ	کون و کنور ہے	کون و کنور ہے	ہندو کے صواب

”دوسری طرف ہندی ہوگی“ ”دوسری طرف ہندی ہوگی“ ”دوسری طرف ہندی ہوگی“

تہ کے نقل کیے ہوئے خط میں کئی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ سطر نمبر ۱ میں ”بہائی آورو“ کی بجائے ”بہائے آورو“ اور سطر نمبر ۱۱ میں ”جس سال میں ولادت میں“ کے بدلے ”جس سال وہ ولادت میں“ لکھا ہے۔ اسی طرح سطر نمبر ۱۵ میں غالب نے ”لکھا“ لکھا ہے اور تہ نے ”لکھ“ لکھا۔ حاشے میں تہ نے سبت ۱۹۱۵ کے بجائے ۱۹۱۵ء لکھا ہے۔ جو درست نہیں ہے، ملاحظہ ہو کہیں خط۔

(۸) نواب سید محمد زکریا، ڈپٹی کمشنر (موتی ۱۳۲۱ء)، غالب کے شاگرد تھے۔ وہ صاحبِ دیوان تھے۔ اور یہ پہلی مرتبہ ۱۸۹۵ء میں چھپا تھا۔ اب نایاب ہو گیا ہے۔ دکن کے حالات جناب مالک رام صاحب کتاب ”مستطافہ غالب“ (ص ۲۳۲) طبع جانی میں موجود ہیں۔ مرزا غالب نے دیوانِ دکن پر چند سطور، بطور سند لکھ دی تھیں۔ ان کا نگہ ”ادب“ لے آؤا دہشت فروری ۱۹۱۳ء میں اور دکنی کا فوٹو اس کے اگلے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ غالب کی تحریر یہ ہے:

مہمانِ اقدس سارانی لکھ کے گھنے کا کس دلت میں اتقاق ہوا ہے  
کہ میں نیم جان چند روز کا مہمان ہوں۔ صبحا بھر سے غذا پائکل  
مفقود ہے صرف گوشت کے پانی پر مدار ہے۔ اھتا دشوار۔ اگر  
انھوں تو دہائی سر سے گر چنوں۔

۲۔ سید محمد زکریا خاں نسب میں امیرزادہ عالی دودمان۔ ان کے بزرگ وزارت کا منصب پانچے ہیں۔ جاگیر اب تک تھی۔ پھر بیوض جاگیر بخش ملز رہا۔ مع ہذا یہ شخص بذات خود نیک اور صاحب علم اور متواضع اور دانش مند اور نیک طبیعت اور رنگیں طبع، معنی سے طبیعت کو طاقہ اچھا ہے۔ شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ اس فن میں میرے شاگرد ہیں۔ اسد اللہ خاں غالب۔

میر = اسد اللہ خاں غالب

(۹) نواب ضیاء الدین احمد خاں تیرہ رشتوں (متوفی ۱۸۸۵ء) کے بڑے صاحب دلوے مرزا شہاب الدین خاں بہادر تھیں (متوفی ۱۸۶۹ء) نے غالب کے ہم عصر قاضی نور الدین قاضی کے مرغب کردہ "تکون اشعرا" (سبب تصنیف ۱۲۶۸ھ) کا مسودہ غالب کے پاس نظر چلی کے لیے بھیجا تھا۔ تذکرے کی ابتدا میں میر کمال الدین حسین تھیں کائن کی تقریب ہے۔ یہ تذکرہ اتر پردیش اور دہلی لکھنؤ نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔ اس کے آخر میں غالب کا ایک نادر و کم باب خط، جو ان کے کسی مجموعے میں نہیں چھپا ہے، شامل ہے۔ خط "تکون اشعرا" (ص ۱۲۷-۱۲۸) میں اول کی عبارت کے ساتھ یوں درج ہے:

مہارت کے ساتھ یوں درج ہے:

مہارت کے ساتھ یوں درج ہے:

مہارت کے ساتھ یوں درج ہے:

مہارت کے ساتھ یوں درج ہے:

کر دیا۔ بعض مواقع پر منجائے اصلاح بھی لکھ دیا ہے۔ مجھ کو یہ  
 پاپہ نصیب کہ آپ کی نثر میں دھل کر دیں۔ تجھوے لامر فوق الادب،  
 نظم بہادار ہوں۔ مرحبا آفرین۔ بخدا خوب نثر لکھی ہے۔ اللہ  
 سبحانہ آپ کو عاریج اعلیٰ کو پہنچا دے اور سلامت رکھے۔  
 مرقورہ دوشنبہ ۱۳ جولائی ۱۸۶۲ عیسوی۔ طوفانوی احباب کا  
 طالب، نقاب۔

(۱۰) نقاب کا ایک نورِ خط جناب سید قدرت نقوی کو قوی صاحب کمر کراچی میں

دستخط ہوا۔ موصوف نے اس کی نقل اور تصنیفات ”ہماری زبان“ مئی دہلی، جلد ۸  
 اپریل ۱۹۹۰ء میں درج کی تھیں۔ ذیل میں یہ خط درج کیا جاتا ہے:

خاں صاحب جمیل المناقب، محرم الاحسان، سعادت و اقبال تو انان  
 سلمہ اللہ تعالیٰ۔

بعد اہدائے حبیب سلام مستون و دعاے ترقی دولت روز افزون،  
 نقاب ٹوٹیں جگر کہتا ہے۔ اللہ اللہ! میرے آقاے نامدار صاحب  
 کاذل و ذوالفقار علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول ہے۔

”عزفت ونبی بفسخ العزائم“

آپ کا قصد تھا کہ کان پر سے اللہ آباد اور وہاں سے نکلتے  
 جائیں۔ سو یہ واقع ہوا کہ کان پر سے آپ بھر لکھو آئیں۔ ۱۲

واللہ! احسان حسین خان بہادر کا حال سن کر بے تاب ہو گیا۔ اتنی  
 طاقت کہاں کہ یہاں سے علی گڑھ تک ڈاک اور وہاں سے آگرہ  
 تک اور کان پر تک ریل اور بھرکان پر تک ڈاک میں پہنچوں  
 اور ان کو دیکھوں۔ ناچار دعا پر ہمار ہے۔ خالص اللہ جلد جناب کی  
 صحت کی توبہ بھیجے۔ ۱۳

یہ نہ جانتا کہ غالب نے اس خدمتِ محقر میں قصور کیا۔ کتاب فرہوش کو کہہ رکھا ہے، مولویوں سے سوال کر چکا۔ تعلیماتِ شیخ دلی اللہ کا کہیں پتا نہ لگا۔ یہ کتاب معرضِ اعلیٰ میں نہیں آئی۔  
قلمی کہیں موجود نہیں۔ ۱۲

ہائے میرا دوست نوروز علی خاں، خدا بخشے اس کو، کیسا لطیف اور خلیق اور دانا آدمی تھا۔ میں کیوں افسوس کروں؟ کیا مجھ کو ہمیشہ یہاں رہنا ہے۔ بموجب قولِ شیخ علی حیات:

مسب گزراہ ایم چاں موج از قضاے ہم

در کاروان ما قد سے نیست استوار

آگے پیچھے سب اُور کو چلے جاتے ہیں۔ کوئی دو دن آگے گیا، کوئی دو دن پیچھے لگا۔ ۱۳

نجات کا طالب، غالب۔ ۱۴

۱۴ فروری ۱۸۶۳ء

(۱۱) نواب علی اور مرزا غالب پر ایک نہایت مختصر مضمون ”سارف“ اعظم گڑھ لبرل جلد ۱۰، باب ۲ دسمبر ۱۹۲۲ء میں چھپا تھا۔ مضمون نگار کا نام قیام اللہ خاں رام پوری ہے۔ مضمون یہ ہے:

یہ مضمون دیکھتے ہی شکستہ خطوط ہیں۔ نواب صاحب مذکور کو اپنے ہاں بلاتے ہیں اور مرزا غالب طرہ کرتے ہیں کہ وہاں آئیں کہیں ملیں گے۔ مرزا غالب آسموں کے بہت شائق تھے۔ نواب صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ ان شاء اللہ تمام قرآنیں حاضر ہوں گی۔ مرزا غالب کے اردو اور فارسی قصائد کے جواب نواب صاحب نے انھیں بزدگانے میں دیا ہے:

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے      غصے بادِ غیب اور آم کھانیں  
سر آواز موسم میں اندھے ہیں ہم      کہ دلی کو چھوڑیں، لہارہ کو جانیں  
ہوا تاج کے جو ہے مطلوبہ جاں      نہ وہں آم پائیں نہ انگور پائیں  
ہوا حکم بادِ غیبوں کو کہ ہاں      ابھی چاکے پچھو کہ کل کیا پچائیں  
وہ کھٹے کہاں پائیں اُلی کے پھول      وہ کڑوے کرپے کہاں سے منگائیں  
فقط گوشت، سو بھیڑ کا روپنے دار  
کہہ اہی کو ہم کھا کے کیا حط اٹھائیں

## حاشیہ

نوٹ۔ حرکت بکراہی۔ نام نئے کام علی، حرکت، چابی نام "نکاح جید" (۱۹۴۳ء)۔ حرکت ۱۱، رمضان  
۱۳۹۳ھ (نومبر ۱۹۷۵ء) کو پیدا ہوئے۔ امیر تائی (موتی ۱۹۷۰ء) سے نکاح حاصل تھا، حرکت کا سہ ماہیہ کام  
پانچ سالوں میں پوری نظر سے گزرا ہے۔ ۲۸ سال کی عمر میں ۱۳ جولائی ۱۳۹۳ھ (۱۹۷۵ء) کو  
۱۹۷۳ء کو نکاح میں انتقال کیا۔ سیدہ مولیٰ ثروت بکراہی نے جنم لیا۔

تکڑے میں حرکت تھی لہجے	نام سحر جاں صاحب کھانے
ہم اور کام علی، حرکت تھی	نہ زینت نہ ہیں جہاد سانسے
دارو نکلتے تھے بہر عباد	داشت در شوقِ عشق نہ دل لہجے
آؤ شیدائے غریبِ فاضل	چاہے بجز یہ نہ دھند آسمان سانسے
مرگِ غریب را جہاد گفت اور	کے ہمراہ آگے تھے متعلق آنے
عشق نہ سہیلیں آبدار کھجور	آہ یہ سہیلیاں ہی یاد دہانے
۱۰ اہل صوفی کھجور بہت	تھہ لہجے لہجہ نام نہانے

سالِ وطن ہے علی کن تارِ تربت

سحر حرکت بکراہی ہے جیسے

۱ ۲ ۳ ۴

(”سحر“ نامیہ ”حزب دوم“)

سیدہ مولیٰ ثروت بکراہی



## عالم اور ”اودھ اخبار“

مشہور نامی کتب اور پبلشر ولنگھور (۱۸۳۶-۱۸۹۵ء) مٹی ہر نگہ مائے مالک اخبار ”کوہ نور“ لاہور کی عازمت ترک کر کے لکھنؤ آ گئے اور یہاں اپنا پریس ”سطح اودھ اخبار“ ۱۸۵۸ء میں کوشی مہاراجا مان سنگھ بہادر میں قائم کیا۔ پھر دوسرے سال ۱۸۵۹ء میں چھوٹی سطح میں ”اودھ اخبار“ جاری کیا۔ اس کے ابتدائی پانچ فیس مل سکے۔ ایک جنوری ۱۸۶۰ء سے جون ۱۸۶۵ء تک اکثر و بیشتر شمارے میری نظر سے گزرے ہیں۔ اخبار اودھ سطوات کا سحر ذخار ہے۔ اس میں عالم کے علاوہ میراجس، مرزا دیر، سر سید احمد خان، مٹی ولنگھور، اسیر لکھنوی، مٹی ہر کوپال قنوت، مہاں داد سراج، مزج باری شاگرد عالم، جواہر سنگھ جوہر شاگرد عالم، جسم دہلوی وغیرہ کے بارے میں بہت سی نئی باتوں کا انکشاف کیا گیا ہے۔ اگر اخبار کے مضامین کا انتخاب کیا جائے تو کئی کتابیں وجود میں آ سکتی ہیں۔

”اودھ اخبار“ میں اردو کی حمایت اور فروغ کے لیے معرکہ آرا مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ کئی مضامین مٹی ولنگھور نے لکھے۔ وہ اردو کے زبردست حامی تھے۔ اخبار کی ۱۳ جولائی ۱۸۶۵ء کی اشاعت میں ایک مضمون اردو کی حمایت میں چھاپا ہے جس میں اردو کے حلقوں کو مسکت جواب دیا گیا ہے۔ اس میں یہ بات ڈنگے کی چوٹ



پرکھی گئی کہ اردو ہی وہ زبان ہے جو ہندوستان بھر میں بولی اور بھلی جاتی ہے۔ اردو کو ایک ایسے درجہ سے تشبیہ دی گئی جس میں مختلف مذاہب آ آ کر شامل ہوتی ہیں۔ یہاں ”مذاہب“ سے مراد مسکرت، عربی، فارسی اور ترکی ہیں۔ مضمون میں وہ نکات الفاظ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اردو رسم خط کی بجائے دیو ناگری اختیار کرنے کا مطلب صرف یہ ہوا کہ ایک نھل اور وسیع زبان کو ترک کر کے کم مایہ اور ناقص زبان قبول کی جائے۔ مضمون کے آخری الفاظ یہ ہیں:

”ہمیں زبان کی حفاظت کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ اس کے ساتھ ہماری ملی زندگی وابستہ ہے۔“

”گودھ اشہار“ مؤرخہ ۱۲ مارچ ۱۹۰۷ء، صفحہ ۳۵۹ پر ایک معلومات افروز مضمون بعنوان ”زبان اردو“ شائع ہوا۔ یہ مضمون چھاپ کے فنی صاحب نے اردو کی حمایت میں حق کوئی کا اظہار کیا ہے۔ لکھا ہے کہ:

اردو کے واسطے حاملوں میں اردو کا رواج انصافاً درست ہے اور اس کا پھل ہونا چند طرحوں سے جو آگے بیان کی جاتی ہیں مبرہن ہے۔ اگرچہ زبان ناگر میں بھی بہت خوبیاں ہیں لیکن چند قبائح ایسی ہیں جو یہ نسبت اردو کے زیادہ تر معطر ہیں۔ اردو زبان سے اگر یہ نظر خامل و قسقی دیکھا جائے تو بہت سی ایسی خوبیاں ظاہر ہوں گی کہ عقل خروہ نہیں اس کو پسند کرے۔ اردو زبان کو اگرچہ تھوڑا عرصہ گزرا ہے کہ ہماری ہوئی لیکن ہندوستان میں اس کا اس قدر رواج ہے کہ دوسری زبان کا نہ ہوگا۔ فرض کیا جائے کہ اردو بکھری سے موقوف کر کے اس کی جگہ ناگری ہماری کی جائے تو صرف ناگری خوانوں سے کام نہیں چلے گا۔ جب تک کہ اس کے اصول یعنی مسکرت کو اچھی طرح حاصل نہ کریں۔ اور ایسے لوگوں کا ضمیر آفاقی المال بہت دشوار ہے جو مسکرت سے بخوبی آگاہ

ہوں اور اگر سبکدوشی دالے ملیں گے تو عدالت کے کام سے محض ناواقف ہوں گے۔ اگر وہ ناواقف لوگ عدالت میں سزا دیے جائیں تو بلا کچھ بوجھے مقدمات فیصلہ کرنے میں سراسر علم ہے۔ پس مناسب ہے کہ رعایا کی توجہ جس علم کی طرف زیادہ ہو دختر میں وہی علم جاری رکھنا چاہیے اور ظاہر ہے کہ ایک دیکھ خواہ اہل اسلام ہو یا اہل ہنود، سب کو فارسی اور اردو کی طرف رغبت ہے۔ چنانچہ ان کے لڑکے قائل تعلیم کرنے کے ہوتے، یعنی جیسے پانچ پھر ہری کو پچھپے دیگی سے ان کو فارسی پڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اب دختر فارسی رہا اور نہ اس کی قدر ہے۔ ہامٹ ہے کہ وہ فارسی اردو وغیرہ کو اپنا علم خاص تصور کرتے ہیں اور اردو کی سبکدوشی سے سبکدوشی اور ناگزیر ہو گئی ہے کہ دیہات اور قصبات میں بھی اردو جاری ہے اور انکی زبان بولتے ہیں جن میں اکثر الفاظ عربی اور فارسی سے شامل ہوتے ہیں۔ بہر نوع، ناگزیر دختر میں بہ نسبت اردو کے زیادہ لوگوں کو وقت ہوگی۔

ناگزری میں ایک بہ نہایت فائدہ ہے کہ لفظ صحیح جس طرح کا لکھا ہوتا ہے ویسا ہی بولا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی نقصان ہے کہ اس کے کہنے میں دیر بہت ہوتی ہے اور کاندھ کی جگہ کو بہت گھبراتا ہے اور چوں کہ اس کا لکھنا پڑھنا بہت جلد آتا ہے اس لیے لوگوں کو اس سے بڑا فائدہ ہوتا ہے کہ وہ کٹھنی وغیرہ آئینے میں لکھ پڑھ کر اپنا کام چلاتے ہیں اور آسانی کے ہامٹ سے جو لوگوں نے ہندی یا کاتھنی نکالی ہے اگرچہ بہت جلد آ جاتی ہے لیکن پڑھنے میں نہیں آتی، یہ نہایت اہل درجے کی برائی ہے۔

اور ناگہری میں جو دیکھا جاتا ہے تو یہ دونوں وصف موجود ہیں  
 باوجود اس وصف کے، بموجب وجوہات مذکورہ بالا کے، دفتر یا  
 عدالت کے قائل نہیں ہے۔

”مذکورہ اخبار“ مورخہ ۱۶ اگست ۱۸۷۰ء (ص ۸۰۴) کی اشاعت میں ڈاکٹر  
 صاحب کی کارکردگی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

”شقی ڈاکٹر صاحب ہمارے محض جلیلہ کے عظیم الشان کارخانے کے مالک  
 شرقی زبانوں کے مجموعی علوم و فنون کی اشاعت میں کمال تہذیب و  
 سرگرمی فرماتے ہیں۔ چنانچہ تازہ تصانیفات و تصنیفات وغیرہ  
 کے ہوا علوم شرقیہ کی وہ قدیم و نادر کتابیں، جن کا نشان یا  
 تذکرہ اور تاریخی کتب یا شاہی کتب خانوں میں پایا جاتا تھا،  
 ہزار ہا روپے کے خرف سے مناسب اربابوں کے ساتھ بچ بچائی  
 گئیں۔ اور اس امر کی نسبت اہتمام ملح ہے کہ جہاں تک ممکن  
 ہو ارضی و کلاسیک کے ساتھ اشاعت عمل میں آئے۔ اس لیے  
 ممالک مغربی و شمالی و پنجاب و وسط ہند و ہندی پرائس و کلکتہ و  
 دیگر اصناف بکال کے بازاروں کتب کے ساتھ سلسلہ تجارت  
 کلاسیک کی بنا پر اس حد و حد کے ساتھ جاری ہے کہ ہر گز  
 کے آخر سات سو آدمی اس کے ماتحت دولت کے تک خوار ہیں۔“

”مذکورہ اخبار“ ہندوستان کے طول و عرض میں نہایت مقبول تھا۔ جن نادر و کم  
 یاب اخباروں کے حوالے اس میں ملتے ہیں، وہ اب ناپید ہیں۔ چند اخباروں کے نام  
 یہ ہیں:

”مذکورہ لاہور، پنجابی اخبار“ لاہور، ”سرکاری اخبار“ لاہور، ”اخبار عالم“ لاہور،  
 ”ڈاکٹر اخبار“ سیالکوٹ، ”غیر خواہ پنجاب“ سیالکوٹ، ”محسن الاخبار“، ”نہم الاخبار“،  
 ”نور اخبار“، ”بحر اخبار“، ”اخبار عالم“ میرٹھ، ”مکتب الاخبار“، ”آئینہ ہند“، ”آلپ عالمی“،

”مطبع القلوب“، ”ماہ پر نور“، ”مجلس الاخبار“، ”مجموعۃ الاخبار“، ”تہذیب الاخبار“، ”نورنی خاطف“، ”صبح صادق“، ”لارنس گزٹ“، ”مصلحت گزٹ“، ”آگرہ“، ”مصلحت طوز“، ”آسیات ہند“، ”کارنامہ لکھنؤ“، ”نورالانوار“، ”آفاق الانوار“، ”مطبع الاخبار“، ”ریاض الاخبار“، ”مداس“، ”قاسم الاخبار“، ”کنج شاکاں“، ”سائنٹک سوسائٹی گزٹ“، ”آئینہ علم“، ”اودھ اخبار“، ”آگرہ“، ”نورنگر“، ”احسان الاخبار“، ”کان پور گزٹ“۔

اخبار مختلف سائزوں میں پختے میں مختلف ایام میں پابندی کے ساتھ چھپتا تھا۔ ابتدا میں ۳۳x۳۳ سنی میل میں سر شہد کو چھپتا تھا۔ پھر چہار شہد اور پختے کے دن چھپنے لگا۔ ۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۶ء تک اخبار کی ضخامت بھی ۱۶ اور بھی ۲۳ صفحوں کی ہوتی تھی۔ جنوری ۱۸۷۰ء سے ہر سر شہد کو تین کالموں میں ۱۱x۱۳ انچ کی تقطیع میں چھپنے لگا۔ ہر سال جلد کا نمبر بدل جاتا تھا۔ سال بھر کے لیے صفحات کا تسلسل رہتا تھا۔ اخبار کی محتاج ادارت اچھے اور قابل لوگوں کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ ان میں غشی شیو پرشاد، نظام محمد تپش، راجی علی، مولانا محمد ہادی اور سرشار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مرزا غالب اور غشی نوکلشور کے درمیان تعلقات مربوط اور استوار تھے۔ غالب اپنی تصنیفات غشی صاحب کے مطبع ”اودھ اخبار“ لکھنؤ میں چھاپنا چاہتے تھے۔ اس بارے میں ۱۸ ماہ جولائی ۱۸۶۰ء کو نوکلشور کے نام اپنی تصانیف کی اشاعت اور ”اودھ اخبار“ سے حقائق لکھتے ہیں:

..... امرود غشی کی کوکم - ہائیکے کہ دیدہ روشن تادہ است، و دل بہ ہوش گردیدہ - ایک فرمان شاہ پر ختم و در نامہ پادشاهی آئینت، بہ تازی غشی کفتم، سر فرید عتر دارم، بیج آہنگ، دھرم شرم، دست، بلکشت کہ در لکھنؤ نیز مردم ہیں نامہ ہائے دانش باشند۔ اگر اوقی لکاردش پادشاهی دارم، چھرا این دواہا با رام فرامی نما رفت۔ رسیدن ”اودھ اخبار“ ازاں سو دہر ماہ چہار بار و رسیدن در ازین سہر ہر سال، دو بار گر منظور است۔ بہ اقبال شخص میںاں داو سیاحت

دعای فرستم و بہ روئی گفتہ ام تا پاری خزلے چند نوشتہ دہد، ہمیں  
کہ ہمیں آرد ہوساے شمار دہاں ی دہرم۔<sup>۱۵۴</sup>

مرزا غالب کا قاری کلام ۱۸۴۵ء میں ”مکاتب آرزو سرالہام“ کے نام سے  
مغرب ہونیکا تھا اور یہ پہلی مرتبہ ۱۸۴۵ء میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تصنیف و ترتیب  
کے بعد مطبع دارالاسلام دہلی میں چھپا۔ مرزا اس کے دوسرے ایڈیشن کو نکلیاتِ علم قاری  
کے نام سے شائع کرنے کے فکرمند تھے اس سلسلے میں جولائی ۱۸۶۱ء میں میر مہدی  
بمردج کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

نکلیاتِ علم قاری کے چھاپنے کی بھی تدبیر ہو رہی ہے۔ اگر اول  
بندہ کیا تو وہ بھی چھاپا جائے گا۔ ”مطبع نربان“ کے خاتے میں  
بکہ فوائد بڑھائے گئے ہیں۔ اگر مقدور مساعدت کرے گا تو میں  
بے شرکت غیر اس کو چھپواؤں گا۔<sup>۱۵۵</sup>

غشی ذلکھور نے ۱۸۶۱ء کے آخر میں مرزا غالب کا نکلیاتِ قاری نواب ضیاء  
الدین احمد خاں سے جو انھوں نے بعدِ خود بڑی مشکل سے جمع کیا۔<sup>۱۵۶</sup> اشاعت کے  
لیے منگوا لیا۔ غشی صاحب نے ”آلودہ اشعار“ مؤرخہ یکم جنوری ۱۸۶۲ء کی اشاعت میں  
نکلیات کی طباعت کا اشتہار شائع کیا۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ مرزا نکلیات کی  
اشاعت کے لیے بے چین تھے۔ اس کے بارے میں سید غلام حسنین قدر بلکرای کو مٹی  
۱۸۶۲ء میں لکھتے ہیں:

اس دفعہ کی قرع سے مراد یہ ہے کہ جناب غشی صاحب سے میرا  
سلام کیجیے۔ اور یہ دفعہ ان کو چھاپا کر عرض کیجیے کہ غالب پوچھتا  
ہے کہ قاری نکلیات کا چھاپا ملوای ہے یا جاری ہے۔ ملوای ہے تو  
کب تک نکلتے گا۔ جاری ہے تو کتنے کس طور پر ہے۔ قصیدے اور  
نکلیات کا مطبع میں چالاک ہے کہ نہیں۔<sup>۱۵۷</sup>

مرزا غالب ”آلودہ اشعار“ نہایت الجھنی کے ساتھ چھاپا کرتے تھے۔ اس کا

اخبار انھوں نے خطوط میں بھی کیا ہے۔ موصوف نے ۱۸۶۱ء میں اخبار منکواۃ شروع کیا تھا۔ مفتی ذوالکفور اگرچہ ان کے نام غفلت رواں کرتے تھے۔ تاہم غالب سال بھر کے ٹکٹ ان کو مطبع ”اروج اخبار“ میں بیکھا کرتے تھے۔ نواب طاء الدین طائی کے نام ۱۸۶۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:

تین ٹکٹ کا روزیہ دار ہوں۔ ساڑھے باسٹھ روپے یعنی ۵۰ روپے سال سرکار انگریزی سے پاتا ہوں اور بارہ سو سال رام پور سے اور چوبیس ان مہاراج (مفتی ذوالکفور) سے۔ توضیح یہ کہ دو برس سے ہر بیٹے میں چار بار اخبار مجھ کو بھیجتے ہیں۔ قیمت نہیں لیتے۔ مگر الزامی ٹکٹ میں مطبع میں پہنچا دیا کرتا ہوں۔

(”خطوط غالب“ صفحہ ۳۵۵، مرتبہ بخش پرشاد)

مرزا صاحب کی کتاب ”طالع نہ ہاں“ مفتی صاحب نے ۱۸۶۳ء میں شائع کی۔ کلیات غالب ابھی تک نہیں چھپا تھا۔ ستمبر ۱۸۶۳ء میں مرزا اپنے شاگرد بدرالدین احمد کاشف کو لکھتے ہیں:

اب سنا ہے کہ وہ کلیات چھپ کر آیا ہے۔ روپے کی فکر میں ہوں۔ ہاتھ آجائے تو بھیج کر میں جلدیں منکواؤں۔<sup>۵۴</sup>

تاریخ ۲۵ جون ۱۸۶۳ء ہے۔ اخبار میں مرزا غالب کے بارے میں ایک اطلاع درج ہے۔ اس میں غالب کا ایک اہم خط مفتی صاحب کے نام درج ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

مفتی صاحب جمیل المناقب جناب مفتی ذوالکفور صاحب کو دولت و اقبال و جاہ و ہلال روز افزوں نصیب ہو۔ چوں کہ احباب کامرانی و شاد کای احباب سے شاد ہوتے ہیں اس واسطے مجھے ان دنوں میں یاد آوری سے ایک امر غرضی کا پیش آیا تو آپ کی غرضی کے واسطے آپ کو لکھتا ہوں بلکہ نظر ہم دگر کے اتحاد پر تم کو



تہنیت دینا ہوں۔ آپ کو بہادک ہو کہ آج ماہ گزشتہ کو جو  
حضرت ملک رفعت نواب علیٰ الغالب بنجاب لکھنؤ گورنر بہادر  
قلمرو بہادک دلی میں تشریف لائے تو سر شہبہ کے دن ۳ مارچ  
۱۸۶۳ء حال کو اس گرام گشت تھیں کو یاد فرمایا اور ازراہ ہند  
ہردی کمال حمایت سے خلعت عطا کیا... (صفحہ ۲۱۷)

اخبار مذکور میں خط سے پہلے غشی فولکھور کی یہ یاد تحریر بھی غالب کے خط سے  
خلعت کے بارے میں درج ہے۔

قدردانی حکام بخت مند ہر زمانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔  
اہل جوہر تعظیم و توقیر کو احباب ہوتے ہیں۔ دیکھیے، ان دنوں میں  
سرکار نے کبھی میرانی کی۔ کمال کی قدردانی کی۔ نواب لکھنؤ  
گورنر بہادر نے مرزا اسد اللہ خاں کو خلعت فاخرہ عطا فرمایا اور  
دیکھیں نوازی کی نظر سے یہ دل افحات کر کے ہم چشموں کو ان کا  
ازاد و اکرام دکھایا۔ زیادہ احتیاج یہاں ہے۔ ان کے خط سے یہ  
حال میاں ہے۔

غشی فولکھور دسمبر ۱۸۶۳ء کے آغاز میں کاروبار کے سلسلے میں لکھنؤ سے دلی  
مکے۔ اور وہاں مرزا غالب، نواب ضیاء الدین احمد خاں، فیروز بخش اور ان کے بیٹے  
نواب شہاب الدین خاں سے بھی ملے تھے۔ یہ غشی صاحب اور مرزا غالب کی بالمشافہ  
مکلی ملاقات تھی۔ مرزا صاحب نے غشی صاحب کے ساتھ دودھان ملاقات کلبا سے فارسی  
کی قیمت پر بھی گفتگو کی۔ اس سلسلے میں غالب، مرزا ضیاء الدین علی کی کو ۳ دسمبر  
۱۸۶۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:

ضیاء مکرم و اللہ جسم غشی فولکھور صاحب یہ سبیلہ ڈاک یہاں  
آئے۔ مجھ سے اور تمہارے بچا اور تمہارے بھائی شہاب الدین  
خاں سے ملے۔ خالق نے ان کو ذہر کی صورت اور مشتری کی

سیرت مطا کی ہے۔ گویا یہاں خود ”قرآن ہمدین“ ہیں۔ تم سے میں نے کچھ نہ کہا تھا اور کلیات کی قیمت نصفہ مان لیے تھے۔ اب ان سے جو ذکر آیا تو انہوں نے پہلی قیمت مستحضرۂ اخبار یعنی قبول کی۔ یعنی فی جلد سہ روپے۔ اس صورت میں اس جلد کے عینے میں دوں اور عینے تم دوں، انکی غنیمتہ مطبوعہ اردو اخبار میں پہنچانے چاہئیں۔ میں دسمبر ماہ حال کی دوسری گیارہویں کو طالب ہوں گا۔ کہو علی حسین خاں کو دے دوں۔ کہو لکھو بھیج دوں۔ اس کارڈ کا جواب جلد دو۔<sup>۶۵</sup>

مرزا غالب نے دہلی میں غشی نوکلشور کے ساتھ جو ملاقات کی اس کے بارے میں غالب مردان علی خاں شخص رجحان کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

غشی نوکلشور صاحب یہاں آئے تھے۔ مجھ سے ملے۔ بہت خوبصورت اور خوش سیرت سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں تمہارے دو مذاہن اور میں ان کا شاخوں۔<sup>۶۶</sup>

غالب ۱۳ دسمبر ۱۸۸۶ء کو ایک اور خط مرزا غلام الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں: نہ دن یاد نہ تاریخ۔ آج چھٹا یا ہفتی شاید بھول گیا ہوں۔ پانچواں دن ہے کہ غشی نوکلشور پہ سواری ڈاک وہ گراے ٹھکڑے ہوئے۔ کل پہنچ گئے ہوں یا آج پہنچ جائیں گے۔ آج روز یکشنبہ ۱۳ دسمبر کی ہے۔ ایک دن غشی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے اور برغوردار شہاب الدین خاں بھی تھا۔ میں نے جاقب کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر میں دلچسپ وار ہوتا تو اس کو تو کڑی کہتا مگر چوں کہ فقیر نکلیے وار ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہیں جگہ کا موزیہ وار ہوں ساڑھے باسٹھ روپے یعنی سال سرکار انگریزی سے پانچواں اور بارہ سو سال رام چور سے اور چھٹس روپے ان مہاراج (غشی)

نولکھور) ہے۔ توضیح یہ ہے کہ وہ برس سے ہر مہینے چار بار اشہار  
 جھ کو بھیجتے ہیں۔ قیمت نہیں لیتے، مگر ہاں پڑتا پس نکتہ میں مطبع  
 میں پانچواں کرتا ہوں۔<sup>۸۶۲</sup>

غنی صاحب غائب کی ملاقات کے بعد دہلی سے لکھنؤ واپس پہلے تو انھوں  
 نے اپنی ملاقات کے بارے میں ”اودھ اشہار“ مئی ۱۸۶۳ء بمطابق ۱۸۶۳ء  
 ۱۲۸۰ ہجری جلد نمبر ۵ صفحہ ۸۵۳ میں ذیل کی اطلاع شائع کی:

جناب فیض آب۔ یکادھر پیدار، کتہ سچ، سراپا اچھار، رنگ افزاے  
 نازک خیالی، پنگامہ آراے مثالی، دیکھ باب فکر و نظر، آسودہ کار  
 اہل ہمزہ، دندہ لوانے سہانی، نوازندہ کوں شیوازدہانی، تاجر نکاح  
 یکسانی، دو مشارق و مغارب جناب میرزا اسد اللہ خان بہادر  
 غائب کی ملازمت سے مشرف ہوا۔ شرف ملازمت کا حصول  
 ملاقات تارہ سے سمجھا۔ مخلصہ ایزدی کا شکر یہ ہے کہ ایسے  
 دخیو مصر، یکادہ آفاق، سرآمو فضلاء روزگار، آفتاب الہیم فضل و  
 کمال سے ملازمت حاصل ہوئی۔

”اودھ اشہار“ جلد ۲ نمبر ۱ صفحہ ۲۳ دیکھ یکم جنوری ۱۸۶۲ء  
 ”ہشتہار طبع کھیا سہ مرزا غائب دہلوی“

اک بشارت غنی مستقیم سے

گوہر آہار لو ہم سے

ایسا حزدہ جاتے ہیں کہ کسی نے جانیں، وہ سامان کرتے ہیں  
 کہ اب تک ہوا نہیں، مرہا کیجیے، شاید شیریں کار آتا ہے۔  
 مہارک ہو، بسف سر بازار آتا ہے۔ عزیز ہر دل عزیز ہے۔  
 دلیری میں کامل ہے۔ جب محتاق دو چار ہوں گے، کھو تھک سے  
 خریدار ہوں گے۔ پردے میں جمال کیا دکھائیے، اب نقاب

چہرہ خن سے اٹھائے۔ آویزہ کوئی جہاں ہو۔ نزدیک و دور عباس  
 ہو کہ نواب مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب دہلوی کا قاری  
 کلیات مطبوع ہوا چاہتا ہے۔ نقش و نگار اس دلا رام رنگیں ہوا کا  
 شروع ہوا چاہتا ہے۔ اقسام خن پر مشتمل ہے۔ ہر ایک شعر  
 فرد بے بدل ہے۔ مالی مضامین، قصائد لاجواب، رنگیں غزلیں  
 انتخاب کر انھیں دیکھ کر قہقہہ کا کمال بھول جائے۔ نظیری کی شوکت  
 کبھی خیال میں نہ لائے۔ مثنوی کی جادو عیانی میں جانے کھٹکو  
 نہیں۔ بحر حلالِ ذلالی کی اس کے سامنے آبرو نہیں۔ رہامیوں کو  
 حکمرانِ خن کے اربع عناصر کیے۔ آبدار قطعات کو بے تردد  
 قطعاتِ جواہر کیے۔ ہر مصرعِ قد سوزوں سے بڑھ کر ہے۔ ہر  
 بیتِ شلو، ماہِ سیمائے معنی کا گھر ہے۔ دس ہزار چارسو کی اشعار  
 ہیں کہ سب سلب گوہر شاہوار ہیں۔ خدا کے فضل سے نسخہ بھی وہ  
 گنج و درست بڑے کتب خانے کا ہاتھ آیا جس کو نواب  
 ضیاء الدین خاں صاحب بہادر دہلوی نے جدوجہد تمام سے جمع  
 فرمایا۔ مقبول آفاق کی تعریف کی حاجت نہیں۔ آفاق کو صفات  
 جہاں کرنے کی ضرورت نہیں۔ باہم کی بے مثنوی آفاق ہے۔ عالم  
 کو ان کی استادی کا اقرار ہے۔ اس زمانے میں صحابی ثانی ہیں۔  
 جوابِ انور و خاکساری ہیں۔ ہر نقطہ ان کے قلم کا اخیر ادبِ کمال  
 ہے۔ جو خفی زبان سے نکلا، بحرِ حلال ہے۔ انکی نادر چیز کہاں  
 میسر آتی ہے۔ کسی خوش نصیب کی یہ امید بر آتی ہے۔ دیکھیے، ہم  
 اور نایاب کے ذمیر لگائے دیتے ہیں۔ موتی کوزیوں کے مول  
 لٹائے دیتے ہیں۔ سب کتابِ تحلیہ چالیس جلد میں چپے کی۔ محض  
 مقام مناسب پر قصورِ صحت کہنے کی۔ شروع طبع میں قیمت بیچنے ۛ

والے چھر کو پائیں گے۔ سبپ بچنے کے بعد چارے سے سبب سزا ہو جائیں گے۔ غالب اہل ہر خلق ہی اعتبار میں آئیں گے۔ پیچھے تو وہ ہاتھوں ہاتھ اٹھالے جائیں گے۔ اشتہار دینے کا یہ سبب ہے۔ صرف اتنا ہی مطلب ہے کہ درخواست بچنے والوں کو اطمینان دیکر رہے گا۔ پہلے ان کا استحقاق مزید نظر رہے گا۔ اگر ابھی سے طلبگار ہوں کئی قیمت کے حقے دار ہوں۔

[”ادبِ اخبار“ جلد ۳، نمبر ۱، صفحہ ۱۸۵، تاریخ ۱۲ مارچ ۱۸۶۲ء]

## نواب میرزا اسد اللہ خاں غالب

سب جانتے ہیں، کچھ جانچ دلیل نہیں کہ ہندوستان میں ان کا عدل نہیں۔ فصاحت و بلاغت میں سہاگن کافی ہیں۔ فنِ شعر میں انوری و شاکانی ہیں۔ زمینی سخن کو آسمان پر پہنچایا۔ ہر نقطے کو اختر ادب معانی بنایا۔ زور فکر ان کا جہاں میں مشہور ہے۔ رنگِ طبع عالی کا آوازہ دور دور ہے۔ جناب جہانیاں نآب ملکہ معظمہ ہندو انگلینڈ کی عادی میں وہ پایہ بلند و درجہ ارفع پائیا کہ اقتدارِ علمداری سرکار سے کسی ہندوستانی کے لیے اس کا سواں حصہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ کیفیت نواب صمدی نے خود لکھی ہے۔ اپنی کتاب ”ہفتہ“ میں مفصل جان کی ہے۔ آگے ایک قصیدہ ملکہ معظمہ کی شان میں کہا تھا۔ ظہر النور سے گزرنے کو ولایت میں بھیجا تھا۔ وہاں تو ہر کمال کی قدردانی ہے۔ کھلا ہوا باب فیض رسائی ہے۔ سب فیض بابِ سعادت ہوا۔ منظور نگار

مرحمت ہوا۔ خود و نواب کی طرف سے آئی۔ سلسلہ شہادت دینے پر طبیعت آئی۔ فروری ۱۸۵۷ء میں پنجاب ریل ٹرک صاحب بہادر نے مصنف کو انگریزی چھٹی نگلی۔ دلائی سے ڈاک پر بھیج کر اس نوبہ سراپا امید سے خبر دی کہ تمہارے قصیدے کے انعام کا معززہ لڑو تجویز ہے۔ مقررہ چھ اٹھائے۔ جو صدور حکم اظہار گورنمنٹ سے اس کی اطلاع پانے۔ ناگاہ مٹی سو لکھہ میں سر دشمنی ہند پر آسمان نوبہ۔ فوجی حوادث نے کل متاع امید کو نوبہ۔ پتھر سے بے گناہ یوں نوبہ آسائے گردوں پہے۔ جس طرح بجلی کے پاٹ تلے گتہوں پہے۔ کیا آغاز تھا۔ کیا انجام ہوا کہ ہر مترصد بھی ناکام ہوا۔ نواب صاحب کا معاملہ گویا خواب تھا:

جہب آنگہ کلی تو کچھ نہ دیکھا

جب نہیں کہ پردہ شہ سلطانی مار توجہ فرمائے عین صاحب پاس میں  
لطیف خسروانی سے امید پر آئے۔ اس تقریب میں ایک ذکر نور  
نیشے کہ ان دنوں جب ”تقریب شہزادہ عالی پانگاہ عالیگیر“ تھی۔  
دہلی میں ایک ورق اخبار کی کھیا ہوا اور اس کے ساتھ دوسرا  
ورق سادہ و چکاہ حکام سے مشاہیر شہر کے پاس پہنچا۔ ہر ایک نے  
اپنا نام لکھ دیا۔ نواب صاحب نے اس راہ سے کہ صاحب سخن  
ہیں۔ مدحت سرائے حضرت ملکہ زمین ہیں۔ یہ شعر بدیہہ کہا ہوا  
لکھ کر مہر کر دی:

شاہ عالی گھر دگوبر پائش، صد جہب

دیں کہ ناچار پیردہ پائش، صد جہب

## ہندوستان کی سمجھ

افغانستان کا روزنامہ مدتہ ودار سے منا جاتا ہے۔ وہی برس سے زیادہ ہوئے، صحابہ اخبار میں دیکھا جاتا ہے۔ فرض سالہا سال گزر گئے۔ سنے سنے کان بھر گئے۔ کسی امر کا ظہور نہ پایا۔ افسانے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ان دنوں بھی وہی ہی باتوں نے شہر میں پائی۔ چاروں طرف لوگوں نے بے پروائی کی اڑائیں۔ ہندوستان کی سمجھ کے قربان کیا کیا عقلیں ہیں۔ کیسے کیسے انسان سے بے ہمدردی ہندو سے، قوطیہ افسانے، محض اپنے گمان پر نیکیوں قیاس لگائے۔ اے بے فکر خدا سے اردو۔ تاجی عالم کو پریشان نہ کرو۔ معلوم نہیں کہ یہ بے اصل باتیں کون گڑھا کرتا ہے؟ خصوصاً وقائع نگاران انگریزی کو کون کھتا کرتا ہے؟ کیا کریں، جب عموماً جھوٹوں کو ایسے اخبارات سے ملو پاتے ہیں تو ہم بھی خوب ضرورت کو احتیاج کر کے اپنے بھینے چھپاتے ہیں۔

آج کل دماغی روزگار، سرآمد احوال بشار، اوسط فطرت، قلعوں بظلمت، جناب والا شان، عالی مقام، مرزا اسد اللہ خان غائب نے جن کی سیاست و امن مستقیم پر قسم کھائیے۔ احتیاج دے سلیم کے صدقے جائے۔ باتوں کی لہرائش میں ایک نظر قرعہ فرمائی۔ ادارے مضمونی خیالی سے قیام ہوا، ایسی تقریر فرمائی۔ ہم اس کو مدینہ اخبار کرتے ہیں۔ اہل جہاں پر آشکار کرتے ہیں۔ بعد اس کے بھی جو غریب مل کر ہیں گی، خوش کنیں ناظرین مشتاق ہوا کریں گی۔

## نثر غالب

یاد رہے دنیا میں جتنے تیرے بندے ہیں سب اپنا پہلا چاہتے ہیں۔  
 فتنہ و فساد سے خوش اور امن و امان کے دشمن ہیں۔ گویا اپنے دن  
 و فرزند، مال و جان کے دشمن ہیں۔ اگرچہ اس ہنگامے میں آپ  
 بھی برباد ہوتے ہیں، لیکن جہاں ہنگامے کی خبر سنتے ہیں، شاد  
 ہوتے ہیں۔ نیکروں بھری ہوئی کشتیاں اس دریا میں سرگوں دیکھ  
 چکے ہیں۔ یہ عافیت دشمن صحت نہیں بکارتے ہیں اور جو کوئی ان کو  
 سمجھائے تو اس سے جھگڑتے ہیں۔ کامل کے اعتبار پر جس رحمت  
 سے کان دھرتے ہیں اور پھر اس اعتبار پر کیا کیا آماج مرث  
 کرتے ہیں۔ سرکار انگریزی کو از بسکہ توجہ صرف رفاہ عام کے  
 ہے۔ اور کا خیال یا قصد جو کچھ ہے واسطے انتظام کے ہے۔  
 بزرگ محال، اگر اس گروہ میں کسی نے کچھ بڑھ کر حوصلہ کیا اور  
 سامان عالی شان مملکت عثمان کا مقابلہ کیا۔ بات صاف صاف  
 ہے۔ جائے انصاف ہے۔ جن مزید من فتنہ حاکموں نے اپنی  
 فوج باغی کو صرف اپنے حسنی تدبیر و ضرب شمشیر سے دبر کیا ہے۔  
 بعدو مسلمان جو اہل ہند انکے فتنہ و فساد سے بچ رہے ہیں اور بعد  
 اس کے دہا و فتنہ کے دکھ سہے ہیں وہ اپنی سلامت و صحت پر خدا  
 کا شکر بجا لائیں۔ نیا پاکیزہ سستا اناج فراغت سے کھائیں۔  
 امن پوسٹ اور ریل گاڑی کی صنعت کو دیکھیں۔ تاریکی میں پیام



کے پہنچنے کی سرعت کو دیکھیں۔ مدرسوں کی روشنی اور رولجِ علم کی کثرت ملاحظہ فرمائیں۔ حکام کی مہربانیاں اپنی نسبت ملاحظہ فرمائیں۔ ملک سراسر بے غم و خوار ہو گیا ہے۔ فکر و ہمت گوار ہو گیا ہے۔ بہشت اور نکبت جو مرنے کے بعد حضورِ قہاب زندگی میں موجود ہے۔ وہ اٹھتا ہے ناقدِ زمان ہے جو انگریزی مملواری سے ناظرِ فساد ہے۔ حکام کو ملک کی آبادی اور رعیت کی آسودگی منظور بہرِ صورت ہے۔ اگر ایسا کوئی اپنے حق کو نہ پہنچے تو یہ اس شخص کی غلطی قسمت ہے۔ آدمی دولتِ خاص کو نہ دیکھے۔ رجبِ عام پر نظر کرے۔ اگر اس کا کوئی مدعا حاصل نہ ہو تو اپنے بہت و قسمت کا ٹکا کرے۔ امن و امان کا طالب، بہت و قسمت کا شکی۔ غالب تھا

[”ادبِ انہار“ لکھنؤ، جلد ۴، نمبر ۱۹، مئی ۱۸۶۴ء]

## خیالِ خیرِ مالِ رحا

محرم خاکسار صاحب: ”ادبِ انہار“ سلامت

آپ کے انہارِ حق نگار مہر ۲۳ اپریل سنہ ۱۸۶۱ء میں عبادتِ تہذیب و تعلیم جواہر حضرت استادِ جناب و ملاقاتِ مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی دامِ افاضت کی در بابِ تجدید و ترمیمِ محام و کج فہمانی بعدِ میری نظر سے گزری۔ جس سے یہ مقصود ہے کہ انوارِ جنگِ ایرانیان و افغانوں میں خام طیلِ لوگ کیا کیا خیالِ خام کرتے ہیں۔

بہ موجبِ مضمونِ خیر اندیشی جناب مرشدنا و استادنا حضرت غالب

دام اعظم عبادۃ سمو الہاں، تسبیح شریعت جنگ اہل ایمان با  
افغانان از آنجا کہ تحریر جناب ممدوح کی حق جناب اور عین خیر  
اندیشی حاکم و محکوم ہے۔ اس لیے اس کو سچ تسلیم کرنا واجب  
عام نہیں کر کے اس مطلب مافی الضمیر کو حتی التوحیح سمجھ کرنا  
سعادت جان کر واسطے حریف سمجھ کر خاص و عام عرض کر کے  
عارض ہوں کہ آپ یوسلئے اخبار پنج اخبار گوہر پار خود ہندوستان خدا کو  
اس سے حجتہ اور حکام عہد کو اس طرف متوجہ فرمائیے گا۔

[”اللہ اخبار“ جلد ۴، (صفحہ ۲۳۲-۲۳۳)، مطبوعہ ۲۳ دسمبر  
۱۸۶۲ء، چار شہد]

## غالب کا خط

جناب مہتمم ”اللہ اخبار“ زاد مہدم  
آپ کے اخبار اللہ خبر میں کالم ۶۲۱ پر خبر اللہ میں مندرج ہے  
کہ مہاراجا اللہ کے جنگل سے ایک شیر کو کھنٹی میں قید کر کے کئی  
روز گرسہ کر کے جب وہ شہر و شہر سے باز رہا، پھر آہنی میں  
گرفتار کر لائے۔

اے صاحب! مہاراجا تو ہائی ملک اور صاحب اقبال ہیں۔ وہ تو  
شیروں کو اگر چاہیں تو گوسفند سے گرفتار کرنا کر سکتا دیں۔ ان کے  
دمب بدل سے جب شیر بکری ایک گھاٹ پانی میں، پھر ان کو  
شیر کی کیا حقیقت ہے۔ میں اس پر ایک ذکر تہب نیز اور  
لسات حیرت انگیز گرفتاری زندان شیر کا ہے سرو سامانی میں ایک  
معزز شخص کا سناتا ہوں، یعنی ۱۸۵۶ء میں محمد مردان علی شاہ

صاحب نے کہ اس وقت تحصیلدار کوہ مری دارالقرارد گورنمنٹ پنجاب کے تھے اور اب ایک سرکار پنجاب میں ایک اہل کار ہیں۔ خود ایک شیر ڈپاس جنگلی کوہ مری سے زندہ ہیں گرفتار کیا تھا کہ چمروں کا ایک چھوٹا سا صندوق کے طور کا لفظ اسی قدر کھڑا بنایا کہ شیر اس میں سائیکے اور گاڑی لگا دیا تھا۔ ایک شیر مرہم غور اس میں تھا کار آگے۔ کئی سو آدمی جاں صاحب کے ساتھ اس علاقے میں بیچ تھے۔ ایک کو یارا پاس جانے کا نہ ہوا اور اُن شیر دل جری نے دھماکہ اس کے اوپر بیٹھ کر مری سے پھنسا لیا اور پھر اس کے منہ سے بنا کر خود ایک چوہی صندوق میں گرفتار کر کر قید کر لیا۔ اس وقت شیر کا گرج اور شور و غوغا کوسوں تک آدمیوں کے ذہن سے گزر رہا تھا اور لطف یہ کہ جس دن شیر لگا، اسی دن شہسبخت خداداد اور برائت سے اس کو گرفتار کیا اور وہ چار ماہ پالا۔ پھر خفا سے مر گیا۔

یہ بات طشت از بام اظہار من الشمس ہے کہ وہ شیر پورے قد کا تھا۔ خان ممدوح سے صرف شیر کا بکڑ لانا اس لیے کہ بکڑ بچہ نہ تھا کہ ان کی شہامت کی وقت پر ظہور میں آتا ہے یعنی جب وہ انک کی حدود پر تحصیل دار وغیرہ رہے تو ملک باغی اور ملک آفریدی سے صرف جریہ ہا جا کر بہت سے خوبی اشتہاری مسلح بہادارانہ بکڑ بکڑ لائے اور ہزار ہا روپے سرکار انگریز سے انعام پایا۔

نقد حال میں بھی بخیر خواہی سرکار وہ سبب پھر رہے۔ کوہ مری سے بنارس اور قندھار میں جب کہ وہ دوسری تحصیل میں تھے، کوہستان میں جا کر دیش خداداد رہے۔ غرض شہامت اور برائت و دلیری بھی ایک بڑی نمونہ خداداد ہے اور بھٹی ہے، بکڑ اختیار نہیں اور

ایمر غریب پر بھی محصور نہیں ہے۔ المفروض، خان ممدوح بھی اسم با  
منشی ہے اور حق بجانب مرد کی صلت ہی مردانگی ہے۔  
نقطہ بندۂ استدلال

۱ "اودھ اخبار" جلد ۵، نمبر ۱۹، مؤرخہ ۱۳ مئی ۱۸۶۳ء، روز  
چارشنبہ صفحہ ۳۳۵۔۱

اس شمارے میں اطلاع دی گئی ہے کہ:  
"نکلیات مرزا جالب وٹوئی" سوا بیسٹیس (۳۵) پر میں چھپ کر  
تیار ہے اور مقام مناسب پر تصویر مصطفیٰ بھی یادگار ہے۔ سابق  
میں سوائے حصول عذقی قیمت سچے قرار دی تھی اور بعد ختم سر  
ودیع اخبار کی تھی۔ اب چون کہ رفاہ عام منظور ہوا، قیمت کا گنا  
دینا ضرور ہوا۔ لہذا جن سے عذقی قیمت وصول ہے انہیں تکلیف  
محصول نہ دی جائے گی۔ طبع سے نکلت لگا کر کتاب ارسال کی  
جائے گی اور جو صاحب اب طلب کریں گے ان سے قیمت  
لیں گے۔ اور حصہ و جلدوں کے خریدار کی رعایت بدستور ملحوظ ہے۔  
ان کا حساب علاحدہ فہرست میں ملحوظ ہے۔

دونوں اشتہاروں میں معمولی رد و بدل کیا گیا ہے۔ پہلے اشتہار سے واضح  
ہوتا ہے کہ کتاب نہیں چھپی تھی اور زیر طبع تھی۔ یہ بات کامل ذکر ہے کہ "اودھ اخبار"  
کے حصہ و شماروں میں جالب کی اس کتاب کا اشتہار شائع ہوا ہے۔ اس سے کتاب کی  
مطلوبیت بھی نمایاں ہوتی ہے۔

۱ "اودھ اخبار"، مؤرخہ ۳۰ دسمبر ۱۸۶۳ء، مطابق ۱۸ مئی ۱۲۸۰  
ہجری، روز چارشنبہ، نمبر ۵۴، جلد ۵، صفحہ ۳۸۶۔۱

## نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب

مرزا صاحب اہم پنج بلند نامی کے بادشاہ ہیں۔ سب خاص نام ان کے نام گراہی سے آگاہ ہیں۔ ان کی تعریف زبانِ علم پر لانا گویا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے کہ ان کی صفات حمیدہ اور کمالات پسندیدہ سے واقف تمام زبانوں ہے۔ شعرائے ہند کو ان کے نام سے اعتبار ہے۔ فصحاء قاریں کو ان کی تعریف داخل ہے۔ بار بار نکستا تحصیل حاصل ہے۔ مرزا صاحب نے ایک قصیدہ لارڈ الچن صاحب بہادر گورنر جنرل کشور ہند کی مدح میں بھیجا تو اس کے جواب میں سرگرجا عظم کا دست خطی فریاد آیا۔ اس خط اور قصیدے کے دیکھنے سے پتہ پائز مطلع کو نہایت سرور ہوا۔ لکھا ہے غالب میں یہ قصیدہ نہ تھا۔ اب اس کا چھاپنا ضرور ہوا۔ لہذا مع نقل خطِ نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند ذیل میں تحریر ہے۔ ناظرین باہمین لحاظ فرمائیں کہ ہر شعر بے نظیر ہے۔ خط سے قدروہی سرکاری ظاہر ہے۔ عزت و توقیر میرزا سے تادیر ظاہر ہے۔ وہ ہر ہند۔

نقل خط

کرنل ڈورینڈی صاحب۔ چیف سکریٹری بہادر گورنمنٹ اور وسیلہ قصیدہ بر کاتب انصاف۔

نقل سرنامہ در شہر دہلی خاں صاحب! بسیار مہربان دوستیں میرزا صاحب اسد اللہ خاں غالب سلم اللہ تعالیٰ مرقوم۔ ۳۰ جولائی ۱۸۶۳ء

خاں صاحب! بسیار مہربان دوستان، سلامت۔ قصیدہ باب و نایب اور وحشت ہندیاں نواب مستطاب معنی اتفاق و ہمسایے و گورنر جنرل بہادر نام اقبال و حول گرویدہ، بدو رخ اداست آن مہربان آئی بر چہمی حقیقت ایچان تاپے افروزہ داز گرانمایہ کو بر ہاسے عمر فکر یکتا خود متقی پردہ کہ گنج بر گنج نہاد بود از نظر قولی ہندیاں نواب صاحب صمدی گزشتہ۔ طرب ہراسے خاطر ہاں حضرت

ایمان گفت۔ زیادہ چہ لگاؤ آید۔ فقط (دست خط انگریزی)۔

## قصیدہ در مدح نواب مستطاب لارڈ الگن

### صاحب بہادر مرحوم

یَا کہ مدح خداوند دادگر گویم  
از انچه کفتم ازین پیش بیشتر گویم  
چنانکہ دوست نیارم ثنائے دادگر گفت  
بقدر حوصلہ خوشن کمر گویم  
و دختر ست فزوں مدح و من و نیرہ سری  
ہاں سرم کہ مدی سطر سر ہر گویم  
بریں شکوہ خواہد کہ گویش خاکاں  
وگر زیادہ ازین چیست تا وگر گویم  
جہانکشائے و جہاں پرور و ہاں آراے  
چوں آن قدر عجاہ گفت ای قدر گویم  
وے آہنہاں و من لہساں کہ خرمسار شوم  
چہر مہر و انجم بہ اگر گویم  
کہے و خاک ریش آب زندگی خواہم  
کہے سکا دم و کہ فرشتہ فر گویم  
مدی نود کہ از غلو غلو تر جہم  
مدی خیال کہ از خوب خوشتر گویم  
و نسیب آنچه فرد ریختہ در خاطر  
گفت از رو پیش ہم وگر گویم

کہ ہے مہار فرزانہ لارڈ آگن را  
 وزیر اعظم سلطان بحر و بر گویم  
 بدی کلاہ کہ قز کیاں اذو ہارہ  
 گزاف محبت اگر شاہ تاجور گویم  
 عیا کہ نظیر کواب ثلثہ آمد  
 برم ز چشم و بدل ایں توبہ و بر گویم  
 ز چرخ ازل و چارم ہرود و حزنہ دی  
 طلب کنم نہ و خورشید تا خیر گویم  
 ز شادابی نظارہ دشن ہر دم  
 چشم جہت رنن نظر گویم  
 ز خاک راہ وے اکسیرہ نظر دارم  
 زلم سیاہگر حرف بیم و زہ گویم  
 ز شاعری بہ ندی رسیدہ ام، خواہم  
 کہ رویداد بہ ہوائے سر گویم  
 رطلت ادب آئینی من ہوں ناچار  
 لسانہ گرچہ دراز ست مختصر گویم  
 پس از وصول ہول پیام من کہ ہو  
 اگر نہ آنچہ توہم دریں سطر گویم  
 بزم گر نہ دہ بار چوں سوار شود  
 ز سرگزشت حکایت بہ رکود گویم  
 ہزار دوزخ دارم ہمیں ز یک غنہ ست  
 کہ چوں خام شود آں غنہ ز سر گویم  
 ہم از فساد دل زار و دایہ غم عالم

ہم از خزانہ رنگ چہاں و بیشتر گویم  
 زبانہ دار دہانم شرر قطاں گردد  
 اگر براہ صدمت سبب بگر گویم  
 شود رنگاب نگار در آب ناچیدا  
 اگر روانی سیلاب چہم تر گویم  
 بکچہ ام کبر شب چراغ شس پاش ست  
 خن ر تیرگی طالع ہنر گویم  
 من آں نیم کہ بہ ہنگامہ خن سازی  
 کیے ز خاور و گاہے ز باختر گویم  
 خن نہال نو و کہند باغیاں غالب  
 نہال را بہ نوبی مژدہ شرر گویم  
 طریقی دانی غم را کسے بودہ رفیق  
 خود از صحبت ایی راو نہ خطر گویم  
 در آں دیار کہ گوہر طریق آئیں نصرت  
 ذکاں کشورہ ام و قصبہ کبر گویم  
 ز حو و چاو بیابان غولش در سرکار  
 ہزار گونہ حکایات معتبر گویم  
 خن طراز دعا یافتہ اہل نقل مراد  
 دگر بچاہے شر بعد از ہی اثر گویم  
 دہائے دولج شاہ و وزیر ہموارہ  
 دہم شب کسم آغاز و تا سحر گویم

کلیاتِ نثر کی اشاعت:

منشی نوکلہور جب ۱۸۶۳ء میں مرزا غالب سے دہلی میں ملے تو انہوں نے



غالب کی کئی کتابیں نثر چھاپنے کی خواہش ظاہر کی۔ مرزا نے ان کی درخواست قبول کی۔ فنی صاحب نے اسے پہلی مرتبہ جنوری ۱۸۶۸ء مطابق رمضان ۱۲۸۳ھ میں بڑی مکتبہ میں شائع کیا۔ خاتمہ کتاب پر ص ۲۴ پر ذیل کی عبارت ”خاتمہ الخ“ درج ہے:

”الحمد لله والحمد لله کہ درمی زبان سعید و آردان حمید از مژگانات قلم اچاز رقم جناب مستطاب دلا خطاب، دیر ہر دان، شاعر مجز بیان، ہلکلی شیدا زبان کھستان انکار پروازی، صاحب فکر پنج پستان مضمون طرازی، سر نمرود آسان بلاغت، ماہ نیم برج فصاحت نظیری، ظہر رھب سعدی و فردوسی، غیرت صائب و دلچسپ، خاقانی ملک سخن، تازی سخن مضامین نو و کهن، صاحب جود و کرم، فخر شعرائے عرب و عجم، شیر و شیر خنوری، کج زبان پاری و دری، فصیح الفصحی، المبلغ البلیغ، میر کبر جناب نواب نجم الدولہ دیر الملک اسد اللہ خان بہادر عرف مرزا نور محمد صاحب بہ غائب المشہور الشائق و المصائب، چنانکہ در شان خودی فرماید، بیت:

لجے ز وسایر یو نامے ما  
سازان ہشتم بکار دانی، مایم

الراق:

از سر انصاف منصف را نکاید در کزشت

حق تعالی رجب انصاف ہلا کردہ است

پاری مردہ را شکستہ جان چارہ

غائب مجز بیان کار سمجھا کردہ

کئیات عمر مکتوب اسے ”بیچ آجک“ و ”سور نمرود“ و ”دھنڈو“ کہ در سلامت و

حاجت عبارت لاجواب و بے مثال ست در مطبع آفاق روح عالم جناب فیض آب

نور منیر طاقت، بحر ہمشیر شجاعت، صاحب فضل و مروت، بازوے ہمت داز در جناب

فنی نوکلور صاحب دام اقبال طرخط و حمد، یہ نہایت صحیح و متعجب بہ سی کار گزاران مطبع

موصوف بہاء جنوری ۱۸۶۸ء مطابق ہور رمضان المبارک ۱۲۸۳ھ لباس الطباع پوشیدہ

مغربی اقامہ مطبوعہ خواص و عوام گردید۔ فقط

قطعہ تاریخ المرقہ

دے ہے ایسا نکلیات نثر غالب

کہ شد مسرور ہر طبعی و طبعی

رقم دو بیسی سال از نوے انصاف

یور مطبوعہ طبعی نثر دل کش

۲ ۸ ۲ ۱ ۱

”ادب اخبار“ مؤرخہ ۲۸ فروری ۱۸۶۳ء (صفحہ ۸) میں مرزا غالب کے شاعر مرزا علی خاں رحمتا کا مضمون ”پچھڑ چھاڑ کی تحریر“ ہے۔ اسی اشاعت میں امیر علی حسیم شاکر و حیم دہلوی کی تحریر ہے۔ اس کا عنوان ہے: ”مجاہد اعتراضات لالہ جواہر سنگھ جوہر۔“

۱ ”ادب اخبار“ مطبوعہ ۱۸ فروری ۱۸۶۳ء (صفحہ ۱۰۳)، جلد ۵،

نمبر ۱۶۱

اس شمارے میں جوہر کا ایک خط مرزا امیر علی خاں حیم دہلوی کے قطعہ تاریخ کی اشاعت میں فشی نوکھور کے نام چھا ہے۔ اسی خط میں فشی صاحب کا ذیل کا جواب بھی درج ہے:

ام الخاف نامہ جوہر صاحب کے درج کرنے سے کمال خوش  
ہیں۔ ہم کو بھڑے طبعی کے امداد سے اشاعت کا کیا منصب تھا۔  
لیکن نتیجہ نتیجہ بھڑے طبعی نوبت ہ نفسانیت ہو جاتی ہے۔ اگر  
سلامت رہی حرف و جہاز ہ نفسانیت نہ ہو، مضائقہ نہیں۔ ہ  
مطبوعہ خاطر اس کی اشاعت میں اجاب کی خوشی اور اس کو  
صحت اختیار کیا جانتے ہیں۔

اسی شمارے کے صفحہ ۱۱ میں غالب کے نامور شاگرد نواب شہاب الدین خاں "فہم" قتب فرزند نواب ضیاء الدین احمد خاں تھیں۔ ان کے بیٹے کی تاریخ ولادت قطعی نوکلور کی اس طرح درج ہے:

بریں مژدہ گر جاں فغانم رواست

۳ شعبان المبارک ۱۲۷۹ ہجری، مطابق ۲۳ جنوری ۱۸۶۳ء،  
 دہلی، روز شنبہ کو نواب والا خان، شیخ الجود والا احسان تھوڑی،  
 مگرمی جناب نواب شہاب الدین احمد خاں بہادر خلق الصدوق  
 نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب بہادر دکنی لوہارو کہ جن کا  
 خاندان اعظمی من اقصیٰ ہے اور راقم کو بھی اس خاندان سے نیاز و  
 عقیدت ہے، زمانہ حید و آواہن سعید میں صاحبزادہ بلند اقبال،  
 فرخ قال پیدا ہوا۔

[”ادبہ اخبار“ مژدہ ۱۸ مارچ ۱۸۶۳ء، صفحہ ۲۰]

اس شمارے میں غالب کے شاگرد مردان علی خاں دکنی کی ایک نایاب کتاب  
 ”فہم“ راک“ کا تفصیلی اشتہار چھپا ہے۔ ”فہم“ راک“ کتاب کا تاریخی نام ہے جس  
 سے سال ۱۲۷۹ھ کے اعداد برآہ ہوتے ہیں۔ کتاب علم سبقتی پر ایک اہم  
 تصنیف ہے۔

[”ادبہ اخبار“ مطبوعہ ۲۵ مارچ ۱۸۶۳ء، مطابق ۳ شوال

۱۲۷۹ھ، روز چار شنبہ نمبر ۱۲، جلد ۵، صفحہ ۲۱]

اس شمارے میں قطعی نوکلور کی تحریر، نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر نے غالب کو  
 جو خلعت کاٹرہ بخشا تھا اس کی تاریخ اور غالب کا ایک خط قطعی صاحب کے نام درج  
 ہے۔ مطبوعہ خلعت کی تاریخ ۳ مارچ ۱۸۶۳ء ہے۔

[”ادبِ اقبال“ مؤرخہ ۲۰ دسمبر ۱۸۶۳ء، صفحہ ۱۳۶]

اس میں سید غلام حسین قدر بلکرای شاکرہ غالب کی مثنوی ”قطعا و قدر“ کی طباعت کا اظہار ہے۔

[”ادبِ اقبال“ مؤرخہ ۱۴ اگست ۱۸۶۳ء، مطابق ۲۶ مئی ۱۸۸۰ء،

ص ۱۵۶۲]

اس پر ہے میں مرزا یوسف علی خاں عزیز شاکرہ غالب کا ”قطعا و ہامیہ“ درج ہے۔ اس میں ۳۳ شعر ہیں۔ ابتدا میں مثنیٰ دولکھور کی تحریر بھی ہے۔

[”ادبِ اقبال“ مؤرخہ ۱۶ دسمبر ۱۸۶۳ء، صفحہ ۸۲۳]

اس میں مردان علی خاں رحمتا شاکرہ غالب نے مرزا غالب کے مجموعہ لارڈ ایلن کی تاریخ وقات کا قطعہ لکھا ہے:

وہ مجھ جناب لارڈ ایلن  
چو گشت عیاں قتال مغرب  
از سال وقات او سرورم  
فرمودہ بگو: ”بہال مغرب“  
۱۰ ۸ ۲ ۱۰

اسی شعرے میں غائب شاکرہ غالب کی ایک نزل ۱۰ شعر میں ہے۔ مطلع اور

مطلع یہ ہیں:

اس کو بہلانے کوئی مژدہ دیدار کے ساتھ  
دیکھ سکتا ہو جو مردان تری دیدار کے ساتھ  
غواہش وصل میں غائب کی کوئی دیکھے ہر  
کچھ دماغیں بھی چھی جاتی ہیں اشعار کے ساتھ

۱ "ادب انبیا" مؤرخہ ۳ جنوری ۱۸۶۵ء، صفحہ ۱۲

شقی جو ہر شکوہ تخلص جوہر، تحصیل دار کھنڈ کی ایک نظم "تختِ فرائض گاہِ ملک" اردو کے عنوان سے ۳۵ شعر میں لکھی ہے۔ جوہر تخلص کے دو شاعر تھے۔ دونوں ہم نام بھی تھے اور کھنڈ میں تحصیل دار بھی۔ ایک جوہر مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ ان کے والد ماسے بیچ تل غالب کے بہت قدردان تھے۔ غالب کے دوج ان قادی کا سب سے پرانا تھی نسو، جو آپ تک مظهرِ عام پر آچکا ہے اور خدائش لاہوری پانڈے میں موجود ہے، انیس ماسے بیچ تل کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ۱۲۵۳ ہجری (۱۸۳۷ء) میں لکھا گیا تھا۔ موصوف کا انتقال ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰-۶۱ء) میں ہوا۔ غالب نے تاریخ لکھی۔ "بہادور بی" ماسہ تاریخ ہے۔ دوسرے جوہر گل محمد خاں خاں خاں کے شاگرد تھے۔ ان کا انتقال ۱۳۱۰ھ میں ہوا۔ زبردست نظم ان کے دوج ان میں موجود نہیں۔ غالب یہ شاگرد جوہر کی تصنیف ہے۔ جناب مالک، علم صاحب کو ان جوہر کا کوئی اردو شعر دستیاب نہ ہو سکا۔ مزید تحقیق کے لیے نظم سے پہلا اور آخری شعر پیش خدمت ہیں:

مولوی ہادی علی اٹک از جہاں رفت و مرا  
الحدیث در سید ہاگیر و شمش در دل عزو  
پس جز ای دیگر چہ تاریخ نو نیم نقد من  
رجعت ہادی علی اٹک از جہاں چالم گرد  
۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶  
(۱۸۶۵ء)

اس زمانے میں مرزا تقو کھنڈ میں شقی نو لکھور کے مہمان تھے۔

۱ "ادب انبیا" جلد ۷، نمبر ۳ (صفحہ ۲۱۹)، مؤرخہ ۱۸ مارچ

۱۸۶۵ء، مطابق ۲۹ شوال ۱۲۸۱ھ بروز سرشتہ۔ ۱

مولوی نجف علی خان، غالب کے مداحوں میں تھے۔ انھوں نے غالب کی "قلم نہ ان" کی حمایت میں "دفعہ ہدایاں" لکھی۔ مولوی صاحب نے "وسا حیر" کی

شرح ”سفرِ کرب و ساجز“ کے نام سے ۱۸۶۵ء میں شائع کی۔ اس پر غالب نے تقریباً  
 کھسی جو ”بارخ و بار“ میں شامل ہے۔ مذکورہ شمارے میں ”سفرِ کرب و ساجز“ پر ایل کا  
 اشتہار درج ہے:

اہلِ خود کو مژدہ ہو کہ ”کتاب و ساجز“ کی شرح تصنیف کی ہوئی  
 اشرف المقصود مولوی نجف علی خاں صاحبِ کاظمی زادہ جمہوری  
 (جن کی تصنیف ہر علم میں قابلِ تحسین ہے، چنانچہ شرح  
 غیر موقوف ان کی ”مقاماتِ حریری“ پر قریب سو نحو کے ہے۔ علی  
 الخصوص دہی اور پاٹھری زبان کو سہولت زدہ مٹی سے لیکھا) طبع  
 ہو کر مع عبارت و ساجز کے، تفسیر و ساجز کی احتیاج باقی نہ رہے۔  
 واقعہ شہرِ دہلی بلی ماروں کے محلے میں عظیم محمد حسن مرحوم کے  
 مکان میں نواب محمد حسین خاں عرف چھوٹے مرزا صاحب کے  
 پاس موجود ہیں۔ شرح اس کی قیمت کی مع حصولِ ذاک کے ایک  
 روپے دو آدھ ہے۔“

[”ادب و اخبار“ نمبر ۱۸، جلد ۱، مؤرخہ ۲۲ مئی ۱۸۶۵ء، مطابق  
 ۱۵ مئی ۱۲۸۱ھ، روزِ سہ شنب، صفحہ ۳۹۸، کالم نمبر ۱۱]  
 نواب مرزا اسد اللہ خان بہادر غالب دہلوی۔ نقل مکتوب جناب  
 محطی القاب زیدہ اولاد حضرت خاتم المرسلین ﷺ جو سراجِ علم و  
 تحقیق، مولانا و بالفضل مولانا، اوسط جہ مولوی سید رحیم علی خان  
 بہادر <sup>۶۵</sup> عام نامی خزانہ تحریریں، وارثہ مطبعی ایران و چین،  
 دھبہ مرتی و غیر طالب، مولانا اسد اللہ خان غالب۔

## سرنامہ

بحکمِ تعالیٰ وہ شاہ جہاں آباد بسای مطالعہِ بحرِ زمان و زمانیاں، نجمِ الدولہ

دیور الملک نظام جنگ اسد اللہ خان بہادر غالب تھیں، عرف مرزا نوشہ سطر اللہ واجہہ  
موصول ہوا۔ راقم آٹھ سیدہ رجب علی خانی عنہ از بیکرانواں۔ یازدہ اپریل ۱۸۶۵ء، کلکتہ  
چہ پانچہ شد۔

## عبارت مکتوب

ہو السحان فی کلن صحن و آن  
لاریخ خاطر اشترافات مظاہرہ

تاہا بنی اختر سہر فصاحت، درشتاں میز سامے بلاغت، خروغ انجمن ہمدانیاں،  
مسلم الثبوت ملت زبانیاں، آرائش و شاد قاریاں، صدقات حق من اشتر نکتہ و حق من  
البدایں لحر لہ ددیں زبان غالب اشعرا و میرزائے میرزا یان فضل اللہ سراف، داخل اللہ  
مقامہ بعد از سلائی کہ مہر طیش از ایوان کیوان برتر باشد و شوقی کہ در دہشت آباد چہرہ  
اطلس نکند، واضح باد کہ "قاریخ نہ بان" را از آغاز تا انجام دیدم۔ سوگند براہلہ کہ  
دردنہائے ایمانیہاں باہم دگر از روز ازل مستحکم و معجزہ کردہ اند، از تحقیقات و تدقیقات آں  
پیکانہ گوہر دریا بہ معنی شکے برداشتہ ام کہ خاصہ از شرفی بروجہ قاصر، سینا افادات طبع نقاد  
و ذائقہ نقاد کہ در خاتمہ جالب عبارت مکر آیات ربانہ اند و خاصہ نکات فرزات ہر مرد قم  
عہد احمد و شعر نظیری کہ حسب حال خود نوشتہ اند۔ "تو فلک آمدہ بودی۔ چہ کج اریخ"  
خواندہ، دلم ہند آمد و بواجبش لیکہ اگر چہ ہرزہ گردان کوئے سلامت را کہ سعادت مسلوب  
ایں طائفہ غمہ باشد، راہ حیدر پیودہ باشند۔ کلن ترادہ نیست کہ لغزت از خود پیوہ درشتاں  
بارخ افانہ انوار نقادہ شد و کم مایہ دوز فطرت کہ از عروج بر اوج افلاک معانی بہ  
مراحل پست پیودہ باشد، بہانہ کدو بگمان سر بزدگی خود با سر دہان ارم دہوی برادر می کنند،  
در نظام مایہ شکسان چہ قدر دوسا شدہ باشند۔ حسب حال آں علوی خیال ایچہ مست:

خاتالی! آنکس کہ ہمدانوی رود  
زارخ اند و زارخ را راجی کبک آرد مست

کہیم کہ مار چو پہ کند تن پہ شکل مار  
گو زہر بگر دشمن و گو مہرہ بگر دوست

حرف ناشناسی ہے سعادت اعتراف ہے ”یوالہوس“ کردہ، خلقیہ یوالہوسی پر  
زورے کار آوردہ۔ شرح عبدالواسع ہانسوی پر یوسکان ہم زدیدہ۔ نو فقط ”یوالہوس“ را از  
الفاظ نساخ گفتہ۔ نکل جا دادہ بمعنی بسیار نوشتہ۔ دامن قاتل من دوست و دلمان آل  
رسول را بنا درستی ترکیب عربی و فارسی از تہمت یوالہوس بمعنی کفایت پاک داشتہ۔

فاضل وحید انصاری، فرید الدہر مولوی نجف علی خاں دفع ہرزہ مرہی معترض در  
شرح معنی آیات چنان چہ بی باہست کردہ و سیف الحق در ”الطائیف نجیبہ“، شیرازی کشیدہ  
کہ از زبان اش سبک خارا خاکسری شود۔۔۔ در ”قاطع زہان“ اکثر عبارات لفظی با چنان  
دیدم کہ دحض قرآن را در شدہ خطا را بوجد آورد و تاب و طاقت خواندن نماند۔ مجملہ آں در  
لفظ قاطع سالار دہشت و بعدش آنچہ نوشتہ اند معاذ اللہ نسبت بہ وفات حضرت قاب قوسین  
مرتبہ صلوٰۃ اللہ علیہ وآلہ و آلہ و لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ قلم ایں وقت ہم از عیاض از  
دست می افتد۔ جہب شملی و طرف بلطی لہاے است۔ استغفر اللہ۔۔۔ اگر طالع کتاب ایں  
صنعت را بکار بردہ، ایں شعر بحال صاف:

من و مرہی من ہر دو آہنجاں مجہول  
کہ ہر دو را دو مرہی خوب می باشد

و طرہ بر سر مہند است۔ دریں بارہ جواب آہنجاں صحیح بہ زبانہ نژدہ و بیانی  
کوہ قاف باشد۔ از طرف شدہ سرشارم۔ پس لغوی قلم را معذور خواہند داشت۔

دو لفظی کہ از ان حکم در تمام ایں کتاب دو اختلاف و اشتراک بتوقع آمدہ۔  
بر کتب شد و دو تدور است و قابل الکلمات نیست۔ چرا کہ در کتاب درۃ الخواص فی  
الفاظ الخصوص لفظی ہاے علماے مقرر درج است۔ مجملہ آں لفظ جہد عظیم جم است کہ دو  
محول ایں طرف از کہ معطر زاد اللہ شرف و تمہینا بر سائل دریاے شور است و اکثر علما  
فضلاے عرب و جم و ہند جہد <sup>جہد</sup> جم بہ لفظ می آوردہ و می گویند کہ قر حضرت خدا در



آجہا سے کہ نسبت بہر انسان جہہ است۔ تلخ بزم باید خواند و عند تحقیق غلط است۔ و  
ایں کتاب خردم موجود و ازین جنس و دریں مندرج۔ لیکن کثرتی کہ دکنی در افلاط پکار بردہ۔  
صدائق "الا کثر حکم الملک" است و طوریکہ آں حکرم سرور شد لغات واپرہ برہان قاطع را  
براحتہا ہمیں قطع کردہ اند۔ ملاحظہ فرمایا مائے شرحی نیست کہ جہہ و ہدائی است۔

دل من دانم و من دانم و دانم دل من

لئے درد کم والسلام تلکم و گلن لہ کم۔

چہارم ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ مطابق یازدہم اپریل سنہ ۱۸۶۵ء مقام  
پکراؤں ضلع نورپانہ

[ "اردو اخبار" مؤرخہ ۲۰ مئی ۱۸۶۳ء، صفحہ ۳۵ ]

"حسب النظم حکام تقرر مرزا حاتم علی کا بہ عہدہ نکالت صدر دہلوی و نظامیہ  
ممالک مغربی مشرق کیا جاتا ہے۔"

(نوٹ) "اردو اخبار" کے اس شمارے سے ماہرین قابلیت کی غلط فہمیوں کا  
ازالہ ہوتا ہے، غالب نے "اردو اخبار" سے یہ خبر پڑھ کر ہی مرزا حاتم علی ایک تھر کو  
بغیر کسی تاریخ کے ایک خط تجلیت کے طور پر لکھا تھا۔ اس کا ابتدائی حصہ درج  
ذیل ہے)

صاحب میرے! عہدہ نکالت مبارک ہو۔ منکوں سے کام لیجیے۔  
ہریوں کو تحفہ کیا کیجیے۔ شکوی بچتی، بھوت بولنا میرا شعار نہیں، کیا  
خوب بل چال ہے۔ انداز اچھا، روزمرہ ساف۔ صحیفوں کا  
استغاثہ کیا کہوں، کیا مزہ دے رہا ہے:

نکم صاحب بمسودے میں پھنسا یا

چھتا نیگم نے بے حرمت کرایا

یہ بات قاضی ذکر ہے کہ جناب ہمیشہ شاہ ("خطوط غالب") نے اسے سن

انھوں نے اس کا مکتوب فرض کر لیا۔ یہی مکتوبہ مالک رام صاحب اور غلام رسول تبر مرحوم نے تسلیم کیا۔ "اودھ اخبار" کی اس خبر سے غالب کے غلط کی صحیح تاریخ متعین ہوتی ہے، یعنی یہ غلط غالب نے مئی ۱۸۶۳ء کے آخر میں لکھا ہوگا۔ غلط میں غالب نے جو شعر لکھا ہے، وہ یہی غالب میں نہیں ہے۔

مرزا غالب کا انتقال ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ہوا تھا۔ ان کے انتقال پر لوگوں نے یقیناً "اودھ اخبار" میں بہت کچھ لکھا ہوگا۔ لیکن بد قسمتی سے وہ شمارے دستیاب نہ ہو سکے۔ لکھنؤ کے ناشر الوجود کتب خانہ ناصر یہ میں اس اخبار کے بے شمار شمارے میری نظر سے گزرے ہیں۔ جو چھریں غالب کی وفات کے بارے میں مل سکیں، وہ درج کی جاتی ہیں۔

۱ "اودھ اخبار"، جلد ۱۱، نمبر ۱۵ جون ۱۸۶۹ء، صفحہ ۱۵۷  
 قطعہ تاریخ وفات مرزا غالب، طبع دار المشرق علی الحق، مظہر مجلس ۱۲۵

حیف صد حیف میرزا غالب  
 حیف آں الہیاتی، حیف  
 ہو ذی قصہ و ذی تاریخ  
 شد ہر جہت ز دار قاتی، حیف  
 ہوتا و شفق ہو مرا  
 شد ہر آواز ز دعا گانی، حیف  
 من چہ گویم جہاں ہی برگہ  
 ہر کسے کرد لوح غرابی، حیف  
 پاکش گفت سرخ و ہم گل را  
 شد قبا چاہے ستانی، حیف  
 چہ توں کرد، چوں توں نردان  
 آہ از ما و سخت جانی حیف

کھٹ مقرر، کھوں ز زوے الم

جہ آں خسرو معانی، جہ = ۱۲۸۵ ہجری

اختیار کے اسی شہرے میں جاتی کا مرثیہ اور قطعہ تاریخ ص ۷۷ میں درج ہے۔ چوں کہ یہ دیوان حالی میں ہجراتی مل سکتی ہے اس لیے نہیں لکھی گئی۔ غالب کے ایک اور شاگرد مہاں دلا خاں سیاح کی یہ تاریخ بھی ہے:

نہ مرد آہ غالب کہ نہ لڑ بہ

و جسم بھیاں بلکہ رفتہ ست جاں

رقم کرد سیاح سائنس بچیں

چو شد ہر حق دلتہ دلاں جاں

۱ "لوہہ اختیار"، مکتوبہ عدد دسمبر ۱۸۶۹ء، صفحہ ۱۱۸۸

اس صفحے میں حسین الدین حسین نے غالب کی اولادوں (نواب رحیم الدین عارف کے صاحبزادوں نواب باقر علی خاں اور نواب حسین علی خاں) کے نام غالب کی وفات پر غزل میں تعزیت نامہ لکھا۔ خط کے ہر فقرے سے ۱۲۸۵ھ کے اعداد نکلتے ہیں۔

## تاریخ وقات

آج بجا باقر علی خاں امداد گئیں ہیں اور حسین علی خاں اب غالب ہے جاں ہیں

پھر کیگر دل آزاد حسین الدین حسین آرام میں ہے ہے کیا نکلت نکھوں فلک ہر کی ہیں

آج کھلا ہوا سر پرست چلا گیا ہے اب کھلا سخت ملال ہے

پاسے وہ بھگوان لڑوئی، غاکانی کھائے جہان خن دانی، ہلے شیرازی



## حوالہ جات اور حواشی

- ۱۵۱۔ کتابت عمر کتاب مطبوعہ علی ڈاکٹر، لاہور، ۱۸۶۸ء۔ نسخہ کتب خانہ علی گڑھ، لاہور۔
  - ۱۵۲۔ ”مکتبہ سلیط“ ص ۱۳، مطبعہ بنگال، دہلی، ۱۸۹۹ء۔
  - ۱۵۳۔ ”مکتبہ غالب“ مرتبہ کھنن چنچر، ص ۱۱۱۔
  - ۱۵۴۔ ایضاً، ص ۱۲۱۔
  - ۱۵۵۔ ایضاً، ص ۱۲۱۔
  - ۱۵۶۔ ”مکتبہ سلیط“ ص ۳۰۵۔
  - ۱۵۷۔ ایضاً، ص ۱۲۱۔ ”مکتبہ بنگال“ مرتبہ سید مرتضیٰ حسین لاکھنؤ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور۔
  - ۱۵۸۔ ”مکتبہ غالب“ ص ۳۳۳، کھنن چنچر۔
  - ۱۵۹۔ سید رجب علی خاں۔ خاں بہادر اوسط بہادر خطاب۔ اپنی سید علی خاں۔ اوسط بہادر بنگالوں خلیفہ لکھنؤ میں ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم باپ کے گھر میں حاصل کی۔ ۱۳۰۵ھ میں دہلی گئے اور مفتی مسعود علی خاں آزاد کے مدرسے میں عربی تعلیم حاصل کی۔ قرآنی کتب لکھنے اور کتب گورنر صاحب نے بھرپور کیے۔ ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۹ء) میں فریڈرک جی ادا کیا، ۱۳۱۷ھ میں دہلی کی عمر میں ۳۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ۱۳۱۶ھ (۱۸۹۹ء) کو بنگالوں میں انتقال کیا۔ تاریخ وفات یہ ہے:
- بہار است قلب باں اوسط  
سودہ صاحبہ اہل اہل  
از دہر بہ دولت کھنن چنچر  
دہلی بہار رجب علی خاں  
(تذکرہ ہے بہار)
- اوسط بہادر اور مرزا غالب کے تعلقات بہت دور و نزدیک تھے۔ غالب میں کی غیر معمولی قابلیت اور عبور شاعری کے مدعاں تھے اور ان کی شاعری میں اتنی اور شہسو سودا الطیر کی ہے جو قرطبہ کی۔ اوسط بہادر عالم تھے اور فاضل شاعر تھے۔ مرزا اور قاری طبع کی گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت و ذہن کا اندازہ غالب کی کتاب ”بارگاہ دولت“ سے ہو سکتا ہے۔ غالب اوسط بہادر کے بارے میں بہادر چنچر لکھتے ہیں:
- (۱) مولوی سید رجب علی خاں جن سے اب کھنن چنچر ہی ثابت ہیں، فرائض و عبادت کی روح و دہلی ہیں۔
- (۲) میں تمہیں دیکھوں (قاری مطبوعہ جامعہ دارالفتح دہلی) کا تذکرہ میری طرف سے حضرت مولانا سید رجب علی کی خدمت میں لکھی گئی میری طبیعت کا اظہار کر سکے۔
- (۳) حضرت مولانا مولوی سید رجب علی خاں بہادر کا دہلی مطبوعہ لکھنے والے رہے۔ قسم بخورم یہ جانت ہو کہ ان کا

مرقاۃ و شرافت و عظمت میں ہے اور نگار عالم کی کتابوں میں ہی ہیں۔

(۴) جیسے میری قسم ہے کہ جب یہ خط جھیں گے تو چاہئے کہ ہندو آج بھی دنگ کر مولوی سید صاحب علی خاں بہادر کی خدمت میں لے جائے۔ میرا سلام ہندو بڑا اچھا ہے اور ہندو بڑا فحاش ہے دیانت بچکا ہے اور یہ خط میرے اس اقدام کو ہی حفاظت کے واسطے لے گا اور وہ ملوہست کرے گا کہ اگر ازل تا آخر چلے گی، تاکہ میری امداد و عظمت کا اعجازہ کر سکیں۔

(۵) تم نے یہ لکھا کہ مولوی سید صاحب علی خاں بہادر کا مسلک و شرب جہیز پرستی و عینہ ستانی ہے تو یہ کلمہ کو گویا مجھے ان کا بعد سے دایم یاد دلا رہا ہے کہ ان کی محبت کا چراغ جلا رہا۔

(۶) تم جانتے ہو کہ میں بڑا علی ایمنی علی غالب ہوں اور مجھے ملتا ہوں کہ ان کا بعد ہے اسے اپنا آکا و خداداد سمجھتا ہوں اور اس کا مسلک کوئی نہ چاہتا ہوں۔

(۷) ازل میرے خدمت کی فیرہ عالیہ کھو اور یہ کھو کہ اس خط کے واسطے کہ ہندو انھوں نے دعا و سلام کے طور پر کیا اور شکر فرمایا۔

(۸) سیدی و مولوی سید صاحب علی خاں بہادر کی انجمن میں پارسیائی ہو تو میری طرف سے کوئی اور تسلیم عرض کرے (”پارسی“ وہ دوتہ مرشد سید ذریعہ حسن عابدی، معلومہ، غالب پری پری، لاہور، ۱۹۷۰ء)

۱۰۰۔ مقرر اچھے۔ عالی محمد اسحاق نام۔ عرب مقرر اچھے۔ غالب عہود علی شاہ کروڑا غالب۔ غالب نے مقرر کا ذکر اپنے خطوط میں کیا ہے۔ مقرر تقیدی دوق میں دیکھتے تھے۔ انھوں نے ۱۸۹۸ء میں ایک مسموم ”کراچی“ میر حسن کی ”میر تقی“ اور قسم کی ”میر تقی“ پر لکھا۔ ۱۹۰۵ء میں جب پاکستان لکھنؤ اور قزاق کے درمیان جنگی گھراؤ میں ہے بہت چڑھی اور گویا جنگ کی صورت اختیار کر گئی تو ملتی مسیو نے ”عین الدہر“ ”تہذیب“ نام پر نے مقرر کے پتھروں کو دھڑکی ۱۹۰۵ء میں قول یمن کے طور پر تاریخ کیا تھا۔ مسموم میری نظر سے گزرا ہے۔

”قاطع نرہان“ (مطبوعہ ۱۸۶۲ء)

اور

”قاطع القاطع“ (مطبوعہ ۱۸۶۷ء)

”نرہان قاطع“ محمد حسین تھریزی قم دکن کی مشہور فرہنگ قاری ہے۔ مؤلف نے مقدمے میں چار کتابوں کا بطور ماضیہ کا ذکر کیا ہے: (۱) فرہنگ جہانگیری (۲) مجمع البحرین سرود کاشانی (۳) سرمد سلیمانی (۴) صحاح الادب ہے۔

قاری کے اکثر و بیشتر اساتذہ نے ”نرہان قاطع“ سے استفادہ کیا اور لغات قاری میں اس کی افادیت و اہمیت کو واضح طور پر بیان کیا۔ مرزا غالب نے امام خدر میں دروازے بند کر کے ”نرہان قاطع“ کا مطالعہ کیا اور جذبات کی روانی میں اس کے مؤلف پر تاج توڑ دیکھ اور ذلت آمیز خطے کیے۔ ”قاطع نرہان“ کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

درہم آہار دلی کجی کا شانہ چوں تصویرِ دیوار خانہ از مس و حرکت  
اثر نہ دہشتم۔ اگرچہ چہ بند بودہ ام، اما بے گزار نہ بودہ ام۔  
بگذارش سرگزشت پر دہشتم و موسوم بہ ”دہشتم“ ستا بے ساقم۔ چوں

اُس خط گسترہ آہ و آں تحریر انہام یافت ہر گاہ غم نہائی دور  
آوردی ”برہاں قاطع“ راگر ستے۔ چوں اُس سبب گفتار ہاے  
نا درست داشت و مردم را از راه می برد و من آئینہ آموزگاری  
داشتم، بر حق و باطن خود دل سوخت۔

اور باتوں کے علاوہ غالب نے خود اعتراض کیا ہے کہ مدّ بردہاں کے وقت  
ان کے پاس کوئی ایسا ماخذ نہیں تھا جو دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا غالب نے  
”قاصح نہ بان“ ۱۲۷۶ھ (مطابق ۱۸۵۹ء) میں تمام کی۔ سال تالیف یہ لکھا ہے:

یشت چوں کوشال ازین تحریر آئندہ بردہاں قاطعش نامست  
شد منعی بہ قاصح بردہاں ”دوسرا القاطع“ سال اقامت  
۶ ۷ ۸ ۹ ۱۰

دیباچے کے آخری القاطع یہ ہیں:

کتاب آسمانی نیست کہ چوں و چرا دریں کلید۔ گفتار آدمی است،  
ہر کہ خواہد بخیر و باطن نظر سجد، در گزشتن ایی نام کہ من سہ کردہ ام،  
شرط آنست کہ چوں بدیدہاں ایی سواد سوزید او دل نہند۔ ”برہاں  
قاصح“ در مقابل نہند۔ خشنے ہوسے آں دارند و خشنے ہوسے ایی۔  
ماہم حقیقت مگر نہ جہم غلط ہیں۔ کوہاں خنیں ایی گزارش  
در گزارش برین آرش اساس گزید کہ سر آغاز عبارت کتاب را بنام  
کتاب کہ ”برہاں قاصح“ است اقتیاز داند ام و قلب ”برہاں  
قاصح“ کہ ”قاصح نہ بان“ خواہد بود نام عبارت خویش نہادہ ام۔

صفحہ ۹۳ پر خاتمہ الطبع شروع ہوتا ہے اور ص ۹۴ میں انعام پذیر ہوتا ہے۔

کتاب ۳۰ رمضان ۱۲۷۸ھ (مطابق مارچ ۱۸۶۲ء) کو چارہ طبع سے آراستہ ہوئی۔ ذیل  
میں خاتمے کا آخری حصہ درج کیا جاتا ہے:

... نظیری مثال، نقیر کمال، و قیو زبان، جلی سلطان، استاد پکانہ



بہارِ فرزاد، عالی گوہر، باخوش و خوش عرقی شہرستان، حلقہ فیض را  
عالمِ نواب میرزا اسد اللہ خاں غالب کے حاکمِ فکر و دانش سے  
شہر دست و پیر جو فیضانِ جہاں افروز در ہر سیکہ دم از بند دانی  
بر آورد۔ کیست کہ دستانِ ہمارے کشاد۔ دریں رسالہ بالفرض ہمارے  
برہاں و نمود است و بیانی عقدہ کشا گرہ از کارش کشود۔ چنانکہ  
توسنِ خاموش ہے لہام و لہار رفت بہالا دنی، کھلب ہدایت میں  
گرفت۔ در آخرش فائدہ چند افروزد، رشتہ جہاں را بگوہر آلودہ کہ  
از گراں سنگینش ترازدے نظر چشمِ داریست و ہر یکے بزیادے کوش  
و گویے معنی سزاوار ہاں لہوڑ ہمارے عصمت از خطا و ذلل طرفہ کارنامہ  
نست وایب اہمل نکاہ کہ شعرا اہل انشا سرسری از اں نژد و  
باہ کہ بدید ہمسرت حرفِ خوش در گری۔ از در دانش دریں بازار  
فرخار فریاد و شیریں حیا آگہی دست ہدست برآید۔

”نامتہ الطبع“ کے بعد عمر ہادی اشک، میرزا محمد اسرار علی خان، اشرف علی  
خاں اشرف، شیخ امیر اللہ حلیم، سید محمود احمد چانوی شاکر، غالب، میرزا شہاب الدین  
خاں غالب کی قاری چہ بلیں ہیں۔ آخر میں میرزا یوسف علی خاں عزت کی اردو میں  
ذیل کی تاریخ درج ہے۔

ہاں خرمیادان جنس آگہی	ہے حیا فیض کا بازار غزل
داو غزلی ”کامیاب نہاں“ کی	معنی پاکیزہ و مکتور غزل
حضرت غالب کی ربیع عام سے	ہو گیا سرسبز یہ گلزار غزل
ہمارے کیا کہنا ہے اس کی کات کا	نست ہے یا مکی جو ہر دار غزل
لحمِ مہر، نثر طرفہ اور لطیف	طرزِ استادانہ و انبہار غزل
ہم کمال، طبع عالی، ذہن تیز	فکر غرض، مضمون خوب، اشعار غزل
نہت ان حضرت سے انساں کو نہیں	ہیں اور چراغ کے ہمارے غزل





میرے حضرت نے اٹھائی ہے مگر سرزمینِ فارس میں دیدارِ نظر  
 چھپ چکا جس وقت یہ نوسۂ عزیز  
 ہوگی تاریخِ ان کی "کارِ نظر"  
 ۸ ۷ ۶ ۵ ۴ ۳ ۲ ۱

عزیز کی تاریخ کے بعد غالب کی تقریر "تقریر از مصنف" الفاظِ دلیل میں  
 درج ہے:

از من بمن سلام و ہم از من بمن پیام  
 رنجِ دلی مہارِ سلام و پیام ما  
 ہاں! غالب پییدہ موسے سے نامہ از من بمن غنم کہ آراستہ جز خود بینی  
 و خود نمائی پہ خواستہ گفتی کہ دانشورانِ داگرد و ہنرمندانِ راستی پسند  
 از من نہالِ بر خورد۔ ثنائی کہ از من خیلانِ مانا بہ بیابانِ بھول  
 جاتی علیہ السلام:

بشمِ جاہست کساں کم گزرد

اے ہمارے خاطرِ دانا و نادان در اندرِ داناں جو گفتارِ گزشتہ گان دلہند نیست و  
 نادان را خود پانچ سخن و سخند بچند نیست۔ ہمارے سپاسِ مردی و مہرِ مردی آن مردمِ چشم  
 مہرِ مردی و مہرِ مہرِ مردی آن پناہ گراںمایہ و آن بہادِ بلند پایہ آن سرکشانِ چوں  
 فریدوں ہاضمک و ہفروستہاں۔ چوں سلیمانِ مہور، سراپاِ دانش و ہر جنِ عقلِ عقلی نول  
 کشورِ بجائے آد کہ بخریداری دکانِ بے روئی کمر بستہ، تا عقلی این کھنڈہ ہاورِ اعطبار  
 درست نیست۔ اگر ایں جواں مردِ دل پہ یعنی شیرازہ اوراقِ پریشان نہ پرداختی، کاتر  
 سوادست "قاری نہ ہاں" را پا کاغذِ گردی و کپ آبست فرد کو قی پا سرمدِ فرشِ غریبی  
 تانکہ ہاے ساقی۔ ہر آئینہ کتب حق گزارد من بیابانِ آن نوسۂ مطہر از ششستہ تقریر و  
 تاریخ و زمانِ مہر سرِ نقش و نگارِ انگشت۔ تا چچ کس ہے دستوری صاحبِ مطبع اورہ اعتبار

ایں سواد را در کالیہ اطہار فرد نوازہ ریخت۔ رہائی:

در قاضی نرہاں نگر و اقبالش کز عیب رسد ملک باحتمالش  
بر خاتمہ نقشب خانم غالب ہیں ذیل دوست کہ محنت ”نہر غالب“ سائنس  
۸ ۷ ۲۷

۱۔ نجم الدولہ دیر الملک، اسد اللہ خاں بہادر، نظام جنگ ۱۳۶۶ھ

”قاضی نرہاں“ کا یہ نسخہ نہایت اہم اور نادر و کم باب ہے۔ اس کی ابتدا میں  
بسم اللہ کے بعد غالب نے عقیدے کے طور پر حضرت علی علیہ السلام کا نام ”یا اسد اللہ  
الغالب“ بتا دیا ہے۔ یہ غنی نوکثرہ نے نہایت ہی اہتمام سے شائع کیا۔ قاری کے  
مشہور شاعر، اور باکمال تاریخ کو شیخ امیر اللہ حلیمؒ نے اس کی کتابت کی تھی، اس  
لئے نسخہ خطاط سے پاک ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ غالب کی تاریخی رہائی کے  
بعد غالب کی مہر چپاں ہے۔ جس کے حلقہ تقریباً میں خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا  
ہے۔ حاشیے پر مہر کے بعد اہل مطبع نے جو تین نقش مختلف اہلاد میں چھاپے ہیں،  
غالب نے ان کا بھی ذکر کیا ہے۔

”قاضی نرہاں“ نسخہ مطبع نوکثرہ کے تین سال بعد غالب نے اس کا دوسرا  
ایڈیشن (طبع جانی) مزید اضافوں کے ساتھ ترتیب دیا جو ۱۸۶۵ء میں اکمل المطابع دہلی  
سے شائع ہوا۔ اس پر بھی غالب کا دیباچہ قدرے تفصیل کے ساتھ ”دیباچہ جانی ہدیہ“  
کے تحت درج ہے۔ ذیل میں اس کا آخری حصہ درج کیا جاتا ہے:

”قاضی نرہاں“ کہ صحت نقشب خیال مست، نہ نامہ اعمال  
مست کہ در آں جہاں بہن خواہند سیر۔ احمدی جہاں خواہ نامہ،  
در دل فرود آمد کہ ہر مقامے چند کلا سے چند ہزار ہم و ایں مجموعہ  
را کہ ”قاضی نرہاں“ نام نہاد ام، کس ”دش کا دیانی“  
خطاب دہم۔

تخلص:

ہارم ہزارم ملک و طرز ریش  
ہارست ز میری ہدم تجل ریش  
چوں اسم کتاب قاسم برہان بود  
گردید در قلم کادیانی عکس

حاشا کہ در بیچ گل از عقیدہ خویش رجوع کردہ ہارم۔ سرودن  
خفاہے ریحہ جز افزودن ہوش انگیزہ ندارد۔ یاران جفا کنند و من ہے  
از اسے ہر جفا و قاورم۔ ہانا کوئی دہی یاران خواہ و بس بند نہد،  
چہ دہم، داو در بیج دارد۔ اندر در بیج ندارد، سنگ زنت، شر ہارم۔  
ایک ایسے سوار سرد آسا سیاہ فیک در فراہم آہ۔ ہے آغاز مہارست  
”برہان قاسم“ ہے۔ سخن از آنگھن کی رود۔ مہارست برہان  
قاسم نوشتہ می شود۔

قاسم برہان نے اپنی حلقوں میں لکھل پھا دی اور اس کی حمایت و حفاظت  
میں کئی کتابیں معرض وجود میں آئیں جن سے قابلیت میں خاصا اضافہ ہوا۔ ان میں  
کتب ذیل قابل ذکر ہیں:

- (۱) ”عرق قاسم“ از سید سعادت علی مطبع احمدی شاہدہ، دہلی ۱۸۶۳ء
- (۲) ”قاسم برہان“ کی حمایت میں  
از سواد ہاد کا مکتوب مطبوعہ ”تودہ اخبار“، لکھنؤ ۱۸۶۵ء
- (۳) ”مصابیح لہجی“۔ قاسم  
مطبع اکمل المطابع، دہلی ۱۸۶۵ء
- (۴) ”داغ بندھی“۔ سید نجف علی  
مطبع اکمل المطابع، دہلی ۱۸۶۵ء
- (۵) ”مکتوب برہان“۔ آغا احمد علی  
مطبع مقبرہ امجدیاب، کلکتہ ۱۸۶۵ء
- (۶) ”سولات مہارکرم“  
مطبع اکمل المطابع، دہلی ۱۸۶۵ء
- (۷) ”ساقی برہان“۔ مرزا مہارجم بیگ  
مطبع اکمل المطابع، دہلی ۱۸۶۷ء

(۸) "تجلی حیر" - غالب مطبع اکمل المطابع دہلی ۱۸۶۷ء

(۹) "ہمشیر حیرت" - آغا احمد علی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۸ء

(۱۰) "قائِمِ التَّائِیْد" - مولوی امین الدین امین مطبع مصطفائی، دہلی جولائی ۱۸۶۷ء

مذکورہ کتب پاٹ میں یہ دو کتابیں نہایت اہم اور مطبوعات افزا ہیں۔

(۱) مکتوبِ برہان: یہ آغا احمد علی احمد علی کی تصنیف ہے جو "قائِمِ برہان" کی رو اور "برہانِ قاطع" کی حمایت میں ۱۲۸۲ ہجری مطابق ۱۸۶۵ء میں کلکتے سے شائع ہوئی۔ کتاب ۴۷۵ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا سال تصنیف ۱۲۸۰ھ (مطابق ۱۸۶۳ء) ہے۔ کتاب میں مقدمے کے بعد اصل بحث ص ۲۱ سے شروع ہوتی ہے، ترتیب اس طرح ہے: پہلے "برہان" کے عنوان سے "برہانِ قاطع" کا حلقہ اندراج، پھر "غالب" کے عنوان سے "قائِمِ برہان" کا اعتراض اور اس کے بعد "اتحاد" کے عنوان سے مؤلف کا جواب آتا ہے۔ کتاب کے آخر میں منظوم و منثور تقریریں اور چارٹر تالیف کے قطعات ہیں۔ ایک قلمیے میں سالِ تصنیف اور دوسرے میں سالِ طبع مذکور ہے:

"ام ربّ غالب آخ"  
۱۲۸۰ ۲ ۸ ۲

"تقریر تام علیہ"  
۱۲۸۰ ۲ ۸ ۲

غالب نے اس کے جواب "تجلی حیر" لکھی۔ آغا احمد علی احمد نے جواب الجواب "ہمشیر حیرت" کے نام سے لکھا۔

غالب کی کتاب "سببِ باغِ دو در" (۱۲۸۳ھ) میں ایک قطعہ ۳۱ شعر کا موجود ہے۔ اس کے چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

مولوی احمد علی احمد مجلسِ مولوی

وہ خصوصی گفتگو سے پارس افشا کردہ است

بہاریں ما وہ زبانِ معانی مسلم داشت

تا چہ اند خاطرِ دلا سے او جا کردہ است

غریب را از اسفہانی بدو آتا چہ سود

خاتون در کشور بنگالہ پیدا کردہ است  
 با قلیل و جاتج بردان و مالہ ایک چند  
 لاج و سوگیری و لطف و مدادہ کردہ است  
 صاحب علم و ادب دانکہ ز اطرلاب غضب  
 چون سلیہاں دگر نقرین و دم دا کردہ است  
 انعام جاتج بردان قاصد ی کند  
 آنچه ما کردیم با دے خواہد با ما کردہ است  
 ی کند جامہ بردان ایک بردان تاجہ  
 نیست جز تسلیم قولش ہر چہ انکا کردہ است  
 بحر من توچین ا بحر خولش غصہ جا بہا  
 ہم مراہم خولش ما در دہر رسوا کردہ است  
 غازیان صراہ خولش آورد از بحر جہاد  
 تا نہ چہداری کہ ایما بکار تھا کردہ است  
 آتش نشکی کہ سوزد صاحب خود را غصہ  
 در دہل بھوں شرر در سنگ باہا کردہ است  
 چون نہ باشد ہامہ تفتیح جز رنگ و حد  
 باو غالب ملتہ تر گرفتہ پیدا کردہ است

یہ بات کامل ذکر ہے کہ آغا احمد علی نے اپنی آخری تصنیف میں، جس کا نام  
 "ہفت آسمان" ہے اور جس کا پہلا حصہ غالب کی وفات کے بعد ہی ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ء)  
 میں شائع ہوا، غالب کی تین شہریوں، شہری "درد و دارغ"، شہری "رنگ و دغ" شہری  
 "یک درد" اور غالب کا ذکر کیا ہے۔ کتاب شہریوں سے حعلق ہے۔ "درد و دارغ"  
 میں غالب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"نام تو اسد اللہ خان، شخص غالب، نہ خودی گفت:



غالب نام آورم نام و نظام میری  
 ہم اسم اللہم و ہم اسم اللہم  
 عرف میرزا نوشہ اکبر آبادی مولوی، دہلوی المکن، شاگرد میرزا  
 عبدالصمد اسفہانی کہ بیشتر ہر مرد نام داشت۔ تو بے طبع و قدرت تخی  
 گزاری کلنا و عزا مر او را سلسلہ بلکہ بیشتر عزا و دربارت۔ لیکن  
 خبراتی او۔ کیلیج "طالع نہ ہاں" او کہ پس تر در قتل کاویانی  
 مطابق کرد، و گنجیں جویر مخی جو او از مطاعہ بجایہاے آں خصوصاً  
 "موتہ برہان" و "شمسہ حیرت" بر قاشا نیاں تخی حاصلست۔ در  
 لادیس گزشت میرزا مطہر فروری ۱۸۶۷ء (کذا) توفیٰ عمر او گنجی  
 ہشتاد و دو سال بودہ است۔ مولوی عبداللہم جو تخی تخلص، عادی  
 اسکول میرزا دلاست او کہ در سنہ "یک ہزار و دو صد و ہشتاد و پنج  
 (۱۸۸۵ء) واقع شد، چہیں یافت۔ "نبرد بیجاٹ میرزا نوشہ"  
 (۱۸۸۵ء)۔ امیرش الملک مظفر الدین حیدر خان بہادر مظفر بنگ  
 فرمایہ:

سال میلاد دوست لفظ "فریب"  
 ۱۸۶۱ء

سال فراق "میرزا غالب آہ"  
 ۱۸۶۸ء

پس مر ہشتاد و دو ہشت

(۲) "طالع الطالع": غالب کی "طالع نہ ہاں" کی رد میں یہ ایک ہنگامہ غیر  
 تصنیف ہے جس کے مصنف مولوی امین الدین امین دہلوی ہیں۔ یہ کتاب نادر الوجود  
 ہے اور غالب اس کا ایک کھل اور غالب داسد نسطر کتب خانہ فیضی نعمانی (عمود) کھنڈ میں  
 محفوظ ہے۔ راقم حروف نے آج سے تین سال قبل اس کتاب سے اہم یادداشتیں نوٹ

وَمِنْ بَيْنِهِمْ سَلُّ بْنُ عَلِيٍّ وَهُوَ

مكتبة دار الفکر  
مطبعة دار الفکر  
طبعة دار الفکر

طبع الفاضل مولوی امین الدین امین دہلوی مکتوبہ ۱۸۶۷ء کے مرتبہ کا شکر

کی تھیں۔ اس زمانے میں یہ نہایت اچھی حالت میں تھی۔ وہ یادداشتیں کہیں تک  
ہو گئیں۔ اب جو کتاب دوبارہ دیکھی گئی تو اس کی حالت آخر قحی جلد بندی اس بے درستی  
سے کی گئی ہے کہ کتاب کا تھس لینا دشوار ہو گیا ہے۔ کتاب میں کرم خودگی کی وجہ سے  
ایسی تیز دوا ڈالی گئی ہے کہ دیکھتے ہی دماغ پکراتا ہے اور قاری فزادہ دوسر اور نزلے کا  
شکار ہو جاتا ہے۔

مولوی امین الدین کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ وہ قاری اور فرہنگ نویس  
کے ماہر تھے۔ معلومات وسیع اور مطالعہ گہرا تھا۔ انھوں نے "برہان قاصح" کی حمایت  
میں غالب کے اعتراضات کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ موصوف کا لہجہ غالب سے بھی  
تاریخا درست اور صحیح تھا۔ انھوں نے دشنام کوئی سے بھی اعتراض نہیں کیا۔ چون کہ کتاب  
تیار ہے اس لیے محمد رفعت کے بعد دیباچے کا بیشتر حصہ درج کیا جاتا ہے تاکہ محفوظ  
رہ سکے۔

امین الدین امین کے بچے از خوش پیمان فرسید ارباب سخن و ریختہ  
خوارانِ خوانا احسانِ ہر بر فن است۔ یہی گوید کہ چوں کتاب  
قاصح برہان کہ از تنگی افکار گوہر ثار جناب میرزا اسد اللہ خاں  
صاحب غالب حرمین اکبر آباد ساکن دہلی سنہ ۱۲۸۵ھ قوالی است  
در خصوص نکات اعتراضات ہر چندے از لغات کتاب برہان  
قاصح کہ در تحقیق لغات قاری و عربی و غیر آتھا مجید اعظم است  
بہ پایاں و سر دفتر فرمایا است نزدیک لغت آملیان و جامع آن  
محمد حسین حمزہ دست نہ دور از وصف افزا پرہیزی و دروغ  
انگریزیت ہر ایی انجمن دہلیہ۔ جو ایی کہ فارسی و تاجک شای  
و کج اندیشی و ناپسندی جامع آن بظہور بچہ و شریے ازاں نہال و  
گلے ازاں دام و خیال کہ لحاق را لذت و دماغ را بوسے راحت  
رسانہ نماید و دید کہ نگارندہ ایی اداسی ہے اضافی شعر است و

کھتاری محض ناپائیدار و بے اعتبار۔ لغات و معانی صحیح را غلطی شمارد و خود جز غلط گوئی بہرہ ندارد و قطع نظر ازیکہ دوسر الفاظ ستم باکرہ است و معانی را بیامانی ہائے جور بہرہ نقش و دھنام را کہ سوتیان لب با اعتبار آں نکشاید، سامان دارد است، و کھتار لایقین را کہ بازاریاں نیز ازاں حذر نماید، بنیاد نہادہ است۔

من کہ ازین روش شکانے و ازین صط مکانے در کسے از ذمہ شرفا یافتہ بودم، تعجب نمودم کہ مردہ دو صد سالہ را کہ خاکش ہم بر باد رفتہ باشد۔ بہ نقش و دھنام یاد کردن آنچہ کلام ذی شعور است۔ ہر آنچہ از انصاف پرستان ہنایت ہند و نہایت دور است۔ فرض چوں با مردہ و زندہ سروکار نمی داشتیم ہم را تاویہ و تاشیہہ انکاہتم و از سر ایں کھتار در گزشتیم و دامن ایں خیال از دست نگر فرو گذاشت۔ نا چوں مہدۂ تعلیم حلفان بار و دوش و گردن ایں غیر اندیش است و کلام میرزا صاحب دلی نیست کہ ہر دانشور آں را بہ پذیرد و موردہ بگیرد۔ دوسر الفاظ کہ مبالغہ ایں رسالہ ناظرین کم ہناعت و کوتہ دیدہ ہستہ بے استطاعت ما نمودہ و بیروان و حجابان خویش را خصوصاً موجب گمراہی و سبب از حقایق تا آکاہی است۔ پس درین صورت تصور ہدایتی ضرور است و کاتبی علمی درین باب عین قصور۔ تاچار با وجود ہم فرصتی و بے اسبابی ہا کہ درین زمان در پیش است، کمر سنی بر میان ہمت بر بستیم و سر اسحبہ جواب نگاری اعتراضات بے جا کہ در کتاب مذکور سطور است در شکست۔ لہذا در اندیشہ گذشت کہ جواب نگار را کاتبی ناگزیر است و حرف حرف معترض را حتی المقدور جواب گفتن پند و دل پذیر است و نقش گوئی آنچہ من نیست پس چہ تحریر نمایم کہ از مہدۂ

جواب برآئیں۔ نقشہ کو تاہم خواہم کہ سادہ نگاری کا کارفرمایم و زبان خاصہ را بنگارشی ایسی بخشیں کلمات فزاسام۔ تا کہاں بخاطر ریختہ کہ معترض غرضت را دوست ی دارم و ایسی جہش گفتار را از فائش حقایق ی انکاد سادہ نگاری را زہار خواہم گزید و ہرگز خواہم پندید۔ ہر چند ترا از ی روش بکاگی است و ایسی بکاگی سراسر فزادگی است۔ اما فی دانی کہ طالب کیمت و مطلب دل خواہش جوست کہ فہم کہ استاد ایسی کار بخشی و اختراع کردن فی قوانین۔ لیکن نتیجہ را چاہی کردی و اقتدائے امام برائے چہ روانی داری۔ چوں ایسی مضمون موجب دلیری شد تا چار کھ غریبانہ از طرفائے زمانہ کہ یہ کردم و بزبان کلم سپردم۔

انکون بخندمب ناظرین انصاف مند گذارش است کہ راقم جواب را ہاد کتاب ایسی امر مصلحت نہ سازد و طوق مامست بگردان نیندازد۔ ہر قدر کہ ایسی مصلحتی را بد خواہند گفت۔ فی الحقیقت حقن رو و امام را بہ خدک بد گوئی خواہند ملت کہ اہانت المصلحتی اہانت الامام است۔ المترض چوں بہ قریر ایسی اوراق پرداشتم بہ "طبع القاضی" موسوم ساختم۔ و بناے ترتیب بدیں گو نہ انداشتم کہ سر آغاز سادست برہان قاضی "۱" و "قائِم برہان" "۲" و "قائِم القاضی" "۳" نام ہر سہ کتاب نداشتہ ام و چاہے کہ معترض صاحب "صحیفہ" را کار فرمودہ اند۔ در جواب آں "تاویب" نقل ہست ام و یکہ چاکہ منکو برہان نداشتہ اند مقابل آں حقو برہان رقم کردہ ام و در آخر کتاب چند جا آغاز قول معترض قول و اقتدائے جواب اقوال مرقوم است۔ ہر کسے کہ آں را بظہر آرد حسب ترتیب مذکور امتیاز اقوال را تمکدادر۔

مولوی امین الدین صاحب نے "کاش القامح" ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۳ء) میں ترتیب دی تھی۔ ان ہی کا لکھا ہوا سال تصنیف یہ ہے

شد مرغب در جہاں ایں طرف باغ ہر گے را گمراہاں را شد چراغ  
چوں فراغت یافتہ از غفلت آن عقل ہستم سال زحمت "فرغ"  
۱۲۸۱ھ

کتاب ۲۰۰۲۶۹ سائے میں صفحہ ۳۸۰ پر ختم ہوتی ہے۔ ہر صفحے میں ۲۳ سطریں ہیں۔ کتاب کا متن صفحہ ۲۶۸ کے وسط میں ختم ہوتا ہے۔ پھر اسی صفحے میں محمد یک راحت کا یہ غزل تاریخ طاعت درج ہے:

غالب کہ قلبہ داشت بہ ہندوستان زبیں در علم و عتر از خنی سر آفر  
ی نعت سوسے صاحب زبان بعدی تاکہ برید "کاش زبان" از کیں

قصیدہ آبدار زبان امینی دہلی

ہر چہ خود سستی خود کرد افکار خود را اسد شہرہاں مردہ آلا  
ی کرد قش زمرہاں بلہا صد افکار بے کار کرد حملہ کہ آوردہ بود

قصیدہ آبدار زبان امینی دہلی

شاگرد میرزا احمد ایں غورہ ی زنت "ایں کار از تو آید و مرہاں چنیں کہ  
آیا ز خوردہ گیتی احباب عائد از بحر انتقام مبادا کہ در کہ

قصیدہ آبدار زبان امینی دہلی

موتن نہاد تاکہ شہادہ بہ یک بہ صہبائی ہم بگرد کہ آید بہ رو و کہ  
مہمان صاف صید گلن پیڑہ آمد اما نہ دیدہ بود طراذفہ حسد

قصیدہ آبدار زبان امینی دہلی

ایں غیر ضابطہ چہاں خن چہ نعت در مطبع عزیز جہاں حسن طبع یافت  
ذہن رسا زردے زبیں تالک شگافت تاریخ طبع راحت از یں خوب تر نہ یافت

قصیدہ آبدار زبان امینی دہلی

صفحہ ۲۶۹ پر "خاتمہ" اس کے بعد دارِ رام چند بھیرا نہال چند انگلیس پر تقریر کی تقریب ہے۔ صفحہ ۲۷۰ کے آخر میں گزاری تاجہ آخر کی تقریب دیکر ہے۔ صفحہ ۲۷۲ میں آخر کی تاریخ طبع ہے۔ ماذہ یہ ہے۔ "اے زبے عترتیں" (۱۲۸۳ھ) اس کے بعد صفحہ ۲۸۰ تک "صحت نامہ کتاب قاطع القاطع" ہے۔ اس کے بعد ذیل کا "خاتمہ الطبع" ہے:

بعد طبع شدنی "قاطع القاطع" غلطیہاے کاتب را کہ مصنف صاحب ملاحظہ فرمودہ اند صحت نامہ اش مرتب ساختہ مع خاتمہ کتاب برائے اطہار ارباب نمودہ و نیز تقریب ہائے حمد طبع دریں مطبع آمد۔ امروز کہ تاریخ بست و چهارم ماہ ربیع الاول ۱۲۸۳ھ مقدسہ است در مطبع مصطفائی دہلی باہتمام بندہ محمد حسین خاں علیہ اطہار در برکشید۔

کتاب کا متن ص ۲۶۸ پر ان الفاظ پر ختم ہوا ہے:

لفظی چند بحر ریش خندنگان می دہم۔ آمد، آرد، آزد، آزدہ، آزدائش، بگلش... وغیرہ۔ اس چند لغت دیکر است کہ در "قاطع برہان" فی الحقیقت بر بے معنی رانگش "برہان قاطع" است، جسے کردہ و باز گفتہ کہ اکثر ہر ایی الفاظ دہانہ شدم۔ اقول۔ ہر آئندہ ایی ریش شدہ نہ منسوب بہ مؤلف برہان است، بل منسوب بہ معترضی تاوان است۔ فی واقعہ کہ فرہنگ نگاروں را آئین است کہ ہر لغت را از تر و رنگ ہم آرد۔ تاہذہ دفع کے ما ہم گذر اند و ایی ہاست کہ اہل فرہنگ ہم لغات را از مشہور و غیر مشہور گفتہ اند و بدست خود کے ما نہ گذاشتہ اند۔ و اگر بے قصد از کسے نامہ باشد ہر وہ از حیلہ شہر است و خارج از دائرہ القیام۔

اس کے بعد رکن الدین اتقی صفحہ ۲۶۹ پر خاتمے میں لکھتے ہیں:

چوں ایی تحریر باہتمام رسید و از گر انباری نگارش آید ہر اعتراضات

کہ میرزا اسد اللہ خاں غالب سترہ بر کتاب ”قاری قاطع“ کہ فی الحقیقت بر اثبات قاری دلی موجب خود بر داشت قاطع و ہ نمایش کمال دریا بلکہ خلق لغات زبان قاری دلیہ ہجو خورشید ساطع رقم زدہ بود سجدہ شعی حاصل کردہ۔ طبع حق پند و خاطر راسخی بکند، بطلان لہذا فوائد چند، کہ اول ”قاری برہان“ ملحق است، گرانید۔ انجام کار مشکف کردہ کہ اکثر مطلب لہذا بہ مضامین گزشتہ مانا است یعنی محض بے جا و نارواست و کارش اعتراضات را مزہ اما چوں بامیرزا صاحب موصوف خدا خواست تصور سے و نواسے نمی داشتہ کہ چیزے ہی داشتہ، ناشائستہ از ہی در گذشتہ و کارش را وا گذاشتہ۔۔۔

امین الدین نے غالب کے ”سمیہ“ کے جواب میں اپنی کتاب میں ”تاویب“ کا لفظ استعمال کیا۔ موصوف نے ”تاویب“ میں غالب کے خلاف بہت ہی ناشائستہ اور قاطعی اعتراض زبان کا مظاہرہ کیا ہے اور گالی گلوچ سے بھی دریغ نہیں کیا۔ حالی ”یادگار غالب“ میں لکھتے ہیں:

مولوی امین الدین کی کتاب ”قاری قاطع“ کا جواب مرزا نے کچھ نہیں دیا، کیوں کہ اس میں قتل اور ناشائستہ الفاظ کثرت سے تھے۔ کسی نے کہا، حضرت! آپ نے اس کا جواب نہیں لکھا۔ مرزا نے کہا، اگر کوئی گویا ہمارے کات مارے تو کیا تم بھی لات مارو گے۔ (ص ۴۴)

علامہ سید احمد حسن فرہانی و شاہی مرزا غالب کے مجلس اور قدمدان دوستوں میں تھے۔ ”برہان قاطع“، ”قاری برہان“ اور ”قاری قاطع“ میں ”آواز گلشن“ کے ہمارے پر جو بھٹ تھی اس کے بارے میں وہ غالب سے شوق نہ تھے۔ موصوف نے فرہانی اور ”بہا گیری“، ”بہارِ نجم“ اور ”فرنگی رشیدی“ کے حوالے دیے ہیں۔ فرہانی



کی اصل عبارت، جو دستياب ہوئی ہے، یہ ہے:

”ٲرہانی قاصع“ آواز گشتن ۲ معنی شہرت شدن و مشہور گردیدن  
 باشد۔ بعد از ہی در فصل ذکر آوازہ گشتن نیز در ہی معنی ی نویسند۔  
 ”قاصع نہ ہانی“ بلند آوازہ گشتن ۲ معنی شہرت مسلم۔ جہا آواز و  
 آوازہ گشتن بمعنی شہرت عبادہ نہ من شنیدہ ام و نہ کس شنیدہ  
 باشد۔ ”قاصع القاصع“ ی گوید نہ من شنیدہ ام و نہ کس شنیدہ  
 باشد۔ من ی گویم کہے کہ از دیدن و شنیدن کلام اساتذہ بہرہ نہ  
 دارم۔ ہر آئندہ نہ شنیدہ باشد نہ دیدہ و کہے کہ از کلام استادان بہرہ  
 در است، شنیدہ باشد، بلکہ دیدہ باشد۔

فرہرگانی گفت:

اگر نویسہ از ہی در باز گرم  
 بدشتی در جہاں آواز گرم

ہم او گوید:

کہے کسٹم ہم آنکون باز گرم  
 بکل تا در جہاں آواز گرم

”جہا گھیری“ و در ”بہار نغم“ است: آوازہ صہت، شہرت و ہدی  
 معنی بالغہ آنکون و آوازہ شدن ۲ معنی مشہور و حصارف شدن و در  
 ”لہرنگ رشیدی“ آوازہ بمعنی صہت و شہرت۔

فرہرگانی مرزا غالب کے خیال سے متعلق نہ تھے۔ غالب نے اردو میں ۲

جواب دی:

واقی فرہرگانی نے کھا ہے اور اس کا قول سند مکمل ہے، لیکن  
 معلوم رہے کہ محققین الاداء حکم و زیردستی بہت کہے کہے کہے  
 ہیں۔ حاصرین نے شک کر دیا ہے۔ جیسے میر و مرزا ”لیو“ کو

"لوہو"، اور طرف کے مترادف "کوڑ" پوزن "شوڑ" لکھتے تھے۔  
 خطرہ نے ترک کر دیا۔ بھائی میں کیا کہوں، یہ بزرگوار کیا کیا  
 کچھ کہہ گئے ہیں۔ باقی "ش" صدی نمبر ہوتا ہے۔ "ہوش" و  
 "سازش" اور اس کے نظائر بہت ہیں۔ خاکائی کے ہاں "کاش" حاصل  
 بالعدد "کاش" کا اور "کاش" ضمیر کے ضمین کے ساتھ  
 قافیہ کیا ہے۔ نہ ایک جگہ بلکہ سو جگہ۔ نہ ایک خاکائی نے بلکہ  
 بہت اساتذہ نے۔ بھلا میں تم سے پوچھتا ہوں: آپ کہا، شراب  
 کے ساتھ تاکھا کا قافیہ جائز رکھو گے؟ یقین ہے کہ نہ رکھو گے۔  
 اب ہم نہ حافظ پر اعتراض کریں گے نہ اس ہر خاص میں تنبیہ  
 کر سکتے ہیں۔ قصہ مختصر، میں نے مانا "قاسم القاسمی" نے دوسرے  
 قافوں میں ایک اعتراض دفع کیا۔ آگے کیا کرے گا اور دفع  
 اعتراض بھی اس طرح کہ سوائے ایک شخص کے دوسرے کے کلام  
 سے سند نہ ملے۔ داد کا غالب غالب (علامہ سید احمد حسن فرغانی و  
 شاہی (نمبر ۱) مطبوعہ "نیا دور"، لکھنؤ، اپریل ۱۹۶۵ء۔ مضمون  
 نکل: سید علی جواد زیدی۔ مقالے میں غالب کے اس بار و  
 کم باب خط کا کس بھی شائع کیا گیا ہے۔)

۱. "داد کا غالب" میں حالی "قاسم القاسمی" اور اس کے سوانح کا نام لیے بغیر  
 لکھتے ہیں:

مرزا نے ایک فارسی رسالے کے سوانح پر، جو "قاسم نہ بان" کے  
 جواب میں لکھا گیا تھا اور قس و دھام سے بھرا ہوا تھا، اذکار  
 حیثیت مرثی کی بات بھی کی تھی: مگر جب کامیابی کی امید نہ رہی  
 تو آخر کار انھوں نے ماضی نامہ داخل کر دیا۔ انکے تحقیقات میں  
 دلی کے بعض اہل علم عدالت میں اس بات کے استفسار کے لیے

جائے گئے تھے کہ جو فقرے مذہبی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے ہیں آیا فی الواقع فحش و دشنام منہم ہوتا ہے یا نہیں۔ انہوں نے طریب طوم کو مرزا سے بچانے کے لیے ان فقروں کے ایسے معنی بیان کیے جن سے طوم پر کوئی الزام عائد نہ ہو۔ ان مولویوں کا مرزا سے ملنا جلنا تھا۔ کیا نے پوچھا حضرت! انہوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی؟ مرزا نے اپنا قاری کا یہ شعر پڑھا:

بہر چہ در نگرہی جز نکس مائل نیست  
عیار ہے کسی من شراب فیسی مست

جب یہ مقدمہ داخل دفتر ہو گیا۔ ایک مدت کے بعد لوگوں نے مرزا کے نام گم نام خط حضرت منسٹ و شتم بھیجے شروع کیے جن میں شراب نوشی اور بد مذہبی دلیہ پر سخت فحش اور طعن و عداوت لکھی ہوتی تھی۔ ان دنوں میں مرزا کی عجب حالت تھی۔ نہایت ہلکا اور بے لعل رہتے تھے اور جب بخشی رساں ڈاک لے کر آتا تھا تو اس خیال سے کہ مہار کوئی اسی قسم کا خط آتا ہو، ان کا چہرہ خنجر ہو جاتا تھا۔ (ص ۳۶، ۳۷)

اصل میں یہ غالب ہی تھے جنہوں نے بغیر کسی ملاحظہ کے ”برہان کا طبع“ اور اس کے مؤلف محمد حسین حمیری کی کوشش و تقریریں کا شکار بنایا تھا اور ان کے خلاف نہایت ہی ناشائستہ زبان اختیار کی تھی۔ غالب کی طرف سے جو اعتراض وارد ہوئے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر درست نہیں ہیں۔ برہان کی اسی عظیم کتاب پر جس میں بیس ہزار سے زیادہ اشعار ہیں، غالب کے چند اعتراضات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہم نے مولوی امین الدین امین کی کتاب ”طبع الاطیع“ اور ”طبع نہ بان“ کو بطور پڑھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ غالب نے مؤلف برہان کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ ہم نے اپنے

برہان کی تائید میں دونوں کتابوں کے چند اور اق کے عکس شامل کتاب کہے ہیں۔ غالب خود کو محقق اور مؤلف برہان کو "جہان"، "مہج" اور "مکمل" قرار دیتے ہیں اور عقائد سے کہتے ہیں کہ:

"برہان زبان فارسی چکو نہ تواند دانست"

برعکس اس کے برہان نے بھی محقق ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ برہان کا ذکر ہی کیا، غالب تو فرہنگ جہانگیری اور فرہنگ رشیدی کے مؤلفین کو بھی کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ وہ تمام حدودستانی مؤلفین کو چھ گروا دیتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ:

جہتی فرہنگیں اور چنے فرہنگ طراز ہیں وہ سب بغیر مغز کے ماند،  
بیاز کے چٹکے ہیں۔ ("مورد ہندی"، ص ۲۳۳، مطبوعہ بیچ مبارک علی، لاہور)

غالب نے ہمیشہ "قائل نہ ہاں" اور غلط و غیرہ میں "وسا حیر" کو پیر کے طور پر استعمال کیا۔ وہ غلط فہمی کی وجہ سے "وسا حیر" کو صحیح آسانی اور اس کے نام نہاد محترم کو ہمسار ساسان مانتے تھے اور اسی مناسبت سے اپنے کو خاندانی وجاہت کے باعث ساسان شہم قرار دیتے تھے:

زنیساں کہ ہمیشہ در رودانی مایم سرچشہ راز آسانی مایم  
لجے کہ وسا حیر بود نامہ ما ساسان شہم پہ کاروانی مایم  
حقیقت یہ ہے کہ "وسا حیر" ایک فرضی اور جعلی کتاب تھی جو خود سائنہ زبان میں اکبری دور میں لکھی گئی تھی اور یہ ظاہر کیا گیا کہ یہ قدیم ایرانی زبان میں ایک آسانی سمجھ ہے جو نازل ہوا اور ساسان شہم (نام نہاد ایرانی حکیم) نے اس کا ترمیم خاص فارسی میں کیا۔ غالب نے "سمر نمرد" اور "دہخیز" میں بھی یہ الفاظ استعمال کر کے فریب کھالیا۔ ("بارغ و در"، ص ۲۴۱، مرثیہ دزیرا حسن عابدی)

غالب اسدی طوسی (متوفی ۱۳۶۵ھ) کے لغت فرس ۱۵۰۰ اور حکیم نقران ۱۵۰۰ (متوفی ۱۳۶۵ھ) کی فرہنگ کو بھی از کتب موجود سمجھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اگر اسدی طوسی نے فرہنگ لکھی ہوتی تو محمود غزنوی کے عصر سے

آج تک فرہنگ نگاروں کا مانعہ وہی ہوتا اور اختلاف لفظ و معنی کسی لفظ میں روا نہ پاتا۔ ("عمود ہندی"، ص ۲۳۳)  
 غالب کو "سرمد سلیمانی" سے (ربان کا مانعہ) بھی مشکوک نظر آتی ہے۔  
 "قاری نربان" میں لکھتے ہیں کہ:

من آں پندوم کہ عفا سرمد سلیمانی فروغ افزاے چشم این  
 و سبب۔ انا نہ آں سرمد سلیمانی کہ کنکوسٹ موسوم بدین ام۔  
 بعد من سرمد سلیمانی کہ اسما پری ازکاف آوردہ در چشم مراد کشیدہ  
 بود۔ تا بہ سوپ آں دلچ و پری ما دید نہ خشفت کہ اندر کے ازاں  
 سرمد بدین دکنی رسیدہ باشد کہ لبتہ را معاینہ ی کرد و زبان کاف  
 از آماں ی آموشفت۔

راقم حروف نے "ربان قاری قلیق اور مطبوعہ نسخے" کے عنوان سے چند سال قبل ایک مفصل مضمون مرتب کیا جو پہلے "دانش" اسلام آباد اور بعداً "شیرازہ" سری نگر میں شائع ہوا۔ مضمون میں ان تمام پرانے نگھی اور مطبوعہ نسخوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو دستیاب ہوئے تھے۔ مطبوعہ نسخے ۱۸۱۸ء (نور روک) سے ۱۹۶۳ء (نور معین الدین) تک کوئی نظر رہے۔ ان کی تعداد دس ہے۔ ڈاکٹر معین الدین ("ربان قاری قلیق" چاپ تہران) کے مقدمے میں ۱۳۵۱ "ربان قاری قلیق" نور مہدالحمید مطبوعہ کلکتہ (چانپ) کو نسخہ روک کا تیسرا ایڈیشن قرار دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام خود میں غالب نے اسی نسخے سے استفادہ کیا تھا۔ ڈاکٹر موصوف کے الفاظ یہ ہیں:

غالب (مرزا اسد اللہ خان) ہنگام تحریر "قاری نربان" خود ہمیں چاپ مورد مقابلہ و صحیح جامع طبعی قرار کرتا۔

یعنی غالب کے "قاری نربان" کی ترتیب کے وقت غالب کے کوئی نظر نسخہ حکیم مہدالحمید ہی تھا۔ اس نسخے کی وجہ سے کئی اور لوگوں کو غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایام خود میں غالب نے اسی نسخے سے استفادہ کیا تھا۔ غالب نے

”قاضی نہ بان“ کے پہلے ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۶۲ء میں ”برہان قاضی“ کے کسی مطبوعہ ایڈیشن کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ وہ صاحب عالم بارہردی کو لکھتے ہیں:

اس درماتگی کے دنوں میں چھاپے کی ”برہان قاضی“ میرے پاس تھی۔ اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ (”عمود ہندی“ ص ۶۷)

”قاضی نہ بان“ کے طبع ثانی میں، جو ”دفن کاویانی“ کے نام ۱۸۶۵ء میں دہلی میں چھپا تھا، غالب نے پہلی مرتبہ ”اسطر“ کی بحث میں نسو حکیم مہدالہجہ کا ذکر اس طرح کیا ہے:

وہ ”برہان قاضی“ کہ بعد از ادراختیک در محکمت پہ طبع حکیم مہدالہجہ و مولوی بدیع الدین و مولوی مہدی و چار قاضی دیگر مطبوعہ شدہ است۔ آخر در صلوٰۃ ۵۵ ایں حالت دانشمند از طریق جاتی برہان ستورہ آمدہ، حاشیہ نوشتہ اند۔ (”قاضی نہ بان“ ص ۳۴، مرتبہ قاضی مہدالہجہ)

جناب قاضی مہدالہجہ صاحب مرحوم اس نئے کونو روپک کا تیسرا ایڈیشن لکھتے تھے انہوں نے اپنے مقالے ”غالب بحیثیت محقق“ میں لکھا ہے کہ غالب کے خوش نظر ”قاضی نہ بان“ کی ترتیب کے وقت صرف نسو حکیم مہدالہجہ ہی تھا (”مسودہ غالب“ ص ۳۶۵)۔ قاضی صاحب ہی کی وجہ سے ڈاکٹر محمد صہبن کو بھی سو ہو گیا تھا کیوں کہ انہوں ہی نے ڈاکٹر مصوف کو یہ اطلاع فراہم کی تھی۔ قاضی صاحب عرصہ دراز کے بعد اپنے مضمون ”قاضی القاضی“ میں لکھتے ہیں کہ

غالب نے ابتدا میں جو نسو دیکھا تھا وہ نہ نسو روپک تھا، نہ نسو مہدالہجہ۔ ایک تیسرا نسو تھا... (جو) وہاں (مام پد میں) لوہار سے آیا ہے۔ (”صحیفہ غالب فیبر، لاہور، صلوٰۃ ۲۵۳، مطبوعہ جموری ۱۹۶۹ء)

قاضی صاحب مرحوم نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ آخر غالب کے

پاس وہ کون سا نسخہ تھا۔ ہماری رائے میں دراصل غالب کے خوش نظر ”برہان طالع“ کا وہ نسخہ تھا جسے محمد اعظم کھٹوی نے ۱۲۵۱ ہجری ۳۶-۱۸۳۵ء میں مولوی حاجی محمد امین، مولوی عبدالرحیم، مولوی قدرت اللہ وغیرہ کی گنج سے مطبع افضل الطالع ٹکٹہ سے قادیان میں شائع کیا تھا۔ غالب نے اس نسخے کے حواشی میں اور کئی کئی متن میں ملاحظہ کے خاتمے پر اعتراضات یا توضیحات یا شکوک وغیرہ اپنے قلم سے لکھے ہیں۔ ان کی تعداد ۳۶۵ ہے۔ ان میں سے تقریباً ۳۴۳ الفاظ پر لکھی ہوئی یادداشتوں کو پہلے ”قاری برہان“ اور پھر ”تدقیق کاویاتی“ کے ناموں سے مرتب کر کے شائع کرایا۔ غالب نے ”برہان طالع“ کا یہ نسخہ نواب علاء الدین خاں لودھ کو یکم اگست ۱۸۵۸ء کو تحفے کے طور پر دیا تھا۔ اب یہ نسخہ رضا لاہوری رام پور میں موجود ہے۔ (”آئینہ غالب“، ص ۱۹۲، ملاحظہ ۱۹۶۳ء، دہلی)

”برہان طالع“ نسخہ محمد اعظم کی تصنیفات یہ ہیں:

ملاحظات ۱۹۳۳ء، دو کالمی، ٹکٹہ، قادیان، مرتب سہواریے نسخہ مذہب کے طرز پر جو گنج و تحفہ شائع کیا۔ سرور کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتب نے مولوی عبدالرحیم، مولوی قدرت اللہ، مولوی منصور احمد، مولوی افضل علی کھٹوی، غنی سعید بخت، غنی مہد اللہ خان، مولوی اصغر علی اور شیخ نصیر الدین سے بھی علمی اعانت حاصل کی تھی۔ اس ایڈیشن میں یہ کوشش کی گئی تھی کہ سابقہ نسخوں کے مطابقت میں یہ الفاظ سے پاک ہو۔ اس کا ایک نکل اور محمد نسخہ کھٹوی دہلی کی بیگم لاہوری میں موجود ہے۔





”مضمینہ جیوت“ کے نام سے لکھا جو ۱۸۶۸ء میں لکھنے میں شروع ہوا۔ موصوف کا انتقال ۱۶ ربیع الثانی ۱۲۹۰ ہجری (یعنی ۱۸۷۳ء) کو ہوا۔ (مرتبہ تھوڑے کے لیے ”پہاڑِ دود“ مرتبہ ڈرامہ انجمن شاعری کا سطر ۱۳۲ تا ۱۴۰) دیکھی جا سکتی ہے۔

۵۲۱ ”لکڑی“ سے مراد ”مضمینہ برہان“ ہے۔

۶۲۱ علیحدہ فرس۔ امدادی طرز کی اس فرہنگ کا قدیم ترین مخطوط مکتوب ۹ مکتوب ۳۳۷۷ (۱۳۰۰ ہجری) ۱۸۳۲ء پاؤنی ہوتا (Paul Horn) کو دستخط ہوا تھا۔ اس نے ۱۸۹۷ء میں برلن میں اسے پڑھے اتمام کے ساتھ شروع کیا۔ اس میں کل ۱۲۰۵ نکات ہیں۔ اس کا ایک مکمل نسخہ اقبال فاہرری منظر پرانی دہائی میں بری نظر سے گزرا ہے۔

۷۲۱ حکیم لغویوں کی لغت کا نام ”کامبرینی لغتِ لغوی“ تھا۔ یہ فرہنگ اب ہٹا ہے۔

۸۲۱ سرنہ علیہائی۔ یہ فرہنگ آئی امدادی کی تالیف ہے۔ امدادی ۹۷۳ ہجری (۱۵۵۹ء) میں امدادیوں میں پیدا ہوئے۔ وہ کامبرین میں بھی رہتے تھے۔ سید امدادی علیہائی (م۔ ۱۶۱۶ ہجری مطابق ۱۷۰۰ء) کی نسل سے تھے اور ان کی مناسبت سے امدادی لکھی اختیار کیا تھا۔ امدادی ۱۷۵۵ء تا ۱۷۶۰ء میں ہندوستان آئے۔ پہلے گجرات اور پھر آگرے میں کام کیا۔ وہ ظاہر مکتوب تذکرہ اضرآبادی کے دوست نے انھیں گجرات میں رکھا تھا۔ آگرے میں انھوں نے دوبارہ چھانگیری میں دہائی حاصل کی اور پھر انھیں چھانگیری کے کسی درباری امیر نے انھیں تذکرہ لکھنے کی طرف متوجہ کیا۔ یہ تذکرہ ”موقوفہ امدادیوں“ کے نام سے منسوب ہے۔ امدادی نے ایک ضخیم دیوان کی مشرویں بھی لکھی تھیں۔ امدادی نے ”برہان کاغذ“ کی طرز پر فارسی لغت ”سرنہ علیہائی“ کے نام سے مرتب کیا تھا۔ چنانچہ مختلف امدادیوں میں پیدا ہوا تھا اس لیے فرہنگ کا نام ”سرنہ امدادی“ بھی ہے۔ اس کا سبیل تصنیف معلوم نہ ہو سکا۔ تمام ۱۰۰۰ اور ۱۵۰۰ کے درمیان ترتیب دی گئی ہوگی۔ فرہنگ کا ایک بھی نسخہ بریانی دہائی کے استاد آقا سے منسوب کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ اس پر آقا نے کوئی لکھی تحریف کی یہ یادداشت بھی دیتا ہے:

”لکھی یہ کوئی نسخہ الدین محمد علیہائی مکتوب دامت“

فرہنگ سرنہ علیہائی کو محمد مدنی نے بنی فرقہ راجی سے منجھ کر عوامی کے ساتھ مرتب کیا اور پھر چند سبیل پہلے اسے حرک شریائش کاظمی تھوڑے سے پڑھے اتمام اور خوب صورتی کے ساتھ شروع کیا۔ سرمدی نے خودی حوالہ میں یہ عبادت دیتا ہے:

”آئی طریقہ امدادی علیہائی / سرنہ علیہائی / فرہنگ فارسی / پہ منجھ و عوامی محمد مدنی۔  
مرتب نے لغت کا ایک مخطوط نسخہ اور انور عالم کو تحریروں سے بچھا تھا۔

مضمون کی تہادی کے لیے درجہ اولی کتابوں، اخبار اور رسائل سے استفادہ کیا گیا:

۵۲ ”پہاڑِ دود“، مرتبہ سید ذری انجمن شاعری، مکتوبہ جناب بریانی دہائی، ۱۳۰۰ء۔ ۵۳

۵۳ ”مکتوبہ علیہائی“، لکھنؤ، مندرجہ ذیل آرکائیو، ۱۸۶۳ء۔ ۵۴

۵۴ ”مکتوبہ برہان“، مکتوبہ شیخ بہارک علی، ۱۳۰۰ء۔ ۵۵

- ☆ "ڈاکٹر قائلج: حاتی، مطبوعہ شیخ مبارک علی، لاہور، ۱۹۳۰ء
- ☆ "قائلج نہ پانی" مرتبہ: کاظمی محمد اویس
- ☆ "بر پانی قائلج" مرتبہ: ڈاکٹر سجن الدین، چاپ تہران، ۱۹۶۳ء
- ☆ "بر پانی قائلج" مرتبہ: محمد اعظم کھوسو، ۱۹۵۱ء، کلکتہ
- ☆ "آئینہ قائلج" مطبوعہ انجمن ترقی و ترویج، دہلی
- ☆ "مکملہ قائلج" مرتبہ: محمد عسکر الدین احمد
- ☆ "سہ ماہی" کراچی، جنوری ۱۹۶۹ء، "قائلج نمبر"

## غالب اور رسالہ ”مرقب عالم“

نکیم محمد علی طیب اردو کے معروف ناول نگار تھے۔ ناول نگاری میں ان کا نام مولوی خیر احمد اور سرشار کے آتا ہے۔ انھوں نے کئی ناول تصنیف کیے جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔ مہرت، عکسی سرور، دیول دیوی، گودا، رام پوری، جعفر و عباس، اختر و حبیب۔ بعض ناول انگریزی کتابوں کے ترجمے ہیں۔ مثلاً ”نیل کا سانپ“ جو رائڈر میگرڈ کی تھوپیڑا کا ترجمہ ہے۔ دیول دیوی اور جعفر و عباس تاریخی ناول ہیں۔ محمد علی شعر بھی کہتے تھے اور طیب تکلیف کرتے تھے۔ لے سید علی عباس حسینی کہتے ہیں:

مولانا عبدالحلیم شرر کی طرح ہر دور کی نکیم محمد علی طیب بھی اس زمانے کے مشہور ناول نگار گزرے ہیں۔ ان دنوں حضرات کی زندگی میں اردو وہی طبقہ ابھی آں اور دھڑکتی کی طرح شرر کی اور طیب کی گروہوں میں تقسیم تھا۔ کوئی ”دلگداز“ پڑھتا تو کوئی ”مرقب عالم“ کوئی ”مکھانہ“ کو سراہتا تو کوئی ”مہرت“ کو، کوئی ”موز و درجت“ کو پڑھتا تو کوئی ”جعفر و عباس“ کو، کوئی ”حسن اچھل“ کی خوبیاں نکالتا تو کوئی ”نیل کا سانپ“ کی، کوئی ”مقصود سودھا“ پر ہنسنا، کوئی ”حضرتاں دیول دیوی“ پر۔ طیب نے اسی مقابلے

اور ساجے پر اکتفا نہیں کی۔ وہ معاشرت و اصلاح کے میدان میں بھی دوڑے۔ انھوں نے ”مفتی سرگ“ میں عشق کی سرگرمیاں دکھائیں اور ”گودا“ میں عقیدہ بیگانگی کی ضرورت ظاہر کی۔

محبوب کے حالات زندگی زیادہ نہیں معلوم ہو سکے۔ وہ ہر دوئی کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۸۸ء میں وہاں آنریری مجلسرٹ کے فرائض بھی اہتمام دیے تھے۔ اسی سال ان کی اداوت میں ہر دوئی سے ایک ادبی ماہ نامہ ”مرقح عالم“ کے نام سے شائع ہونے لگا۔ یہ رسالہ ہر مہینے باقاعدہ ”مرقح عالم“ پر لکھی ہر دوئی سے پہنچتا تھا۔ اس کے حصہ و شمارے مختلف کتب خانوں میں میری نظر سے گزرے ہیں۔ یہ ”قرہ کے“ ”دنگدا“ لکھنؤ کے بعد مظر عام پر آیا تھا، یعنی ”دنگدا“ جنوری ۱۸۸۷ء میں اور ”مرقح عالم“ نومبر ۱۸۸۸ء میں پہنچنا شروع ہوا تھا۔

راقم حروف نے جب یہ رسالہ ۱۹۷۰ء میں کتب خانہ ٹیلی لبریری میں دریافت کیا تو تلاش کرتے کرتے کئی اور رسالے و کتاب ہوئے۔ ان میں ”قرہ کا دنگدا“، ”سید اکبر علی فیروز آباد کا“ ”ادیب“، ”ادیب“ الہ آباد، ”ادیب“ جھڑا، ”ادیب“ نظر لکھنؤ، ”اردوے معلے“ (سید احمد شلیخ قیر) ”اردوے معلے علی گڑھ“ (حضرت سوبانی) زمانہ کان چہر، ”عصر جدید لکھنؤ“، ”دکن راج“، ”تخون“ لاہور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان تمام رسالوں میں ”مرقح عالم“ نہایت ہی صالح سحر اور درست پہنچتا تھا۔ کتابت اور طباعت بڑی شاندار ہوتی تھی۔ کاغذ دلانچ ہوتا تھا۔

”مرقح عالم“ کا سائز  $12\frac{1}{4} \times 12\frac{1}{4}$  انچی میٹر تھا۔ ہر صفحے پر خوبصورتی کے لیے جدول بھی دیتی تھی۔ متن ۱۰×۸ انچی میٹر میں پہنچتا تھا۔ فی صفحہ ۲۱ سطریں تھیں۔

اگست ۱۸۹۶ء کے شمارے میں صفحہ ۷ سے ۸۸ تک ایک مضمون ”مرزا اسد اللہ خاں غالب“ کے عنوان سے چھپا ہے۔ مضمون نگار فرید آباد شلیخ دہلی کے نواب سید احمد شلیخ خاں بہادر تھیں۔ موصوف ہر پانچس نواب امین الدین خاں بہادر دہلی لوہارو کے داماد اور مرزا غالب کے رشتے دار تھے۔ قیر کے ”اردوے معلے“ ثابت

نومبر ۱۸۹۷ء کے اولین شمارے کے صفحہ ۶ میں تحریر نے ”مرتب عالم“ کا اشتہار دہلی کے اہلکار میں شائع کیا تھا:

”مرتب عالم“ (جو آٹھ برس سے جاری ہے) اردو لٹریچر سے اگر آپ کو خفا ہے اور علمی مضامین جو حسن و عشق کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوں اگر دیکھنا پسند کرتے ہیں تو آپ ضرور ”مرتب عالم“ کو ایک نظر دیکھ لیں۔

”مرتب عالم“ ہفت اگست ۱۸۹۶ء کے صفحہ ۷۹ میں زیر صاحب مصنف ”تہذیب“ کا ایک خط رسالے کے حلقوں میں چھپا:

بدو حلیم - جو سچی محبت کے مرام پھرتے اور آپ کے درمیان دائر ہیں وہ قریب قریب ”مرتب عالم“ کے گرامی قدر ناظرین پر ظاہر ہوئے اور اسی بنا پر اسباب بھگے بھجھہ کرتے ہیں کہ میں ”مرتب عالم“ کے جن بڑھانے کی نسبت آپ سے کچھ کہوں... بھگے معلوم ہے کہ آپ حکیم ہیں، با وضع اور راست باز ہیں۔ چادر سے زیادہ پاؤں پھیلاتے کو چل دھکا جاتے ہیں۔ اسی سبب سے میں نے اپنے دوستوں کو فقط اسی قدر جواب دیا کہ اہل حلق میں ہو کر آپ میرے اس خیال پر ماسے دینی فرمائیں جو ”مرتب عالم“ کے داسے سے میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں وہ شخصی کوشش سے نہیں چل سکتا... اس لیے مناسب ہے کہ ایک لائبریری قائم ہو جو ہر ہفت روزہ لگے۔ اس کا نیکو نظریہ کون؟ حکیم محمد علی خاں اور کون! وہ لائبریری ہر ممبر کی خدمت کے واسطے حاضر رہے گی۔ ہر روز سو اسباب سے کچھ زیادہ ”مرتب عالم“ کے اس وقت کا کچھ اور قدمدان ہیں۔ اگر فی الحقیقت وہ روپے باور دار

بھی اس قوی اور نکل کام دین تو لیجئے۔ ”مرقع عالم“ کا حجم بڑھا دیا جائے۔ مجھے اپنے اصحاب کی رائے لیجی ہے۔ میں ایڈیٹر کی جانب سے وکیل ہوں۔ والسلام

امیر شفیق - ۱۵ فریڈ آف، ضلع دہلی - ۲۱ ستمبر ۱۸۹۶ء

اسی طرح محمد علی طیب اپنے رسالے ”مرقع عالم“ مطبوعہ ۱۸۹۸ء، جملائی کے شہرے میں سطر ۳ میں اردوئے معلّے کے بارے میں لکھتے ہیں:

نواب سید امیر شفیق نے ۱۸۹۷ء میں ”اردوئے معلّے“ نامی رسالہ اپنے اجتام سے جاری کیا۔ ابتدا میں اس پر سب میں ایک ناول (کنولا) کا ہی سلسلہ جاری تھا۔ بعد ازاں اس میں علمی اور اخلاقی مضامین اور عربی جانتوں کے ترسے بھی چھپتے تھے۔ پہلے اس رسالے میں اردو ناول ”کنولا“ چھپا تھا۔ رسالے کی ظاہری حالت نکستی، چھپائی اور کافہ کے اعتبار سے بھی قدر دانی والی نظروں میں کسی حسین کی باری صورت سے کم نہیں۔ سالانہ ایک مدد پہ ۴۴ آدہ - تیر دہلی کے ایک معزز طبیب ہی میں اور ہر ہائٹس نواب لوہارو کے ملازم۔ ان کے چانچٹ حالات سے جہاں تک ہم کو واقفیت ہے وہاں تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے ”اردوئے معلّے“ کو اپنے کسی ذوقی لٹچ اور بھود کے خیال سے بھی جاری کیا نہ ہوگا اور نہ خدا کے فضل سے ان کو اس کی ضرورت ہے۔ بلکہ وہ اس ذریعہ سے اپنے ملک اور قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہوں گے۔

تیر کا جو مضمون محمد علی طیب نے ”مردا اسد اللہ علی عالم“ کے عنوان سے اپنے رسالے ”مرقع عالم“ میں اگست ۱۸۹۶ء کے شمارے میں شائع کیا تھا وہ مطبوعات

افزا اور نہایت دلچسپ ہے۔ "سرجِ عالم" کے پڑھنے والوں کو موجود ہیں۔ اور اس میں قالب پر جو مضمون ہے اس کا حوالہ "تالیفات" میں میری نظر سے کہیں نہیں گزرا۔ اور باتوں کے علاوہ اس میں قالب کی پائلوٹی کی اہم ناک موت اور قالب کی بے بسی کا انکشاف بھی کیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ تالیفات قالب میں بطور کسی عنوان کے ایک قطعہ ہے۔ اس میں زیادہ شعر ہیں۔ اور وہ "بلی" کی تعریف میں ہیں۔ مضمون سے پہلے قطعے کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں:

دلم سجھاں گرے پاکیزہ جہادے  
کز بال پری زاد بود سوچ رم او  
سر سب لہا چلا بہ دیش باز غرام  
از خاک وہ لہجہ ز نقش قدم او  
چوں صورت آئینہ ز افراط لطافت  
آیہ بہ نظر چہ نہ از حکم او  
ہر چہ کہ کجنگ بوسے باز سپارد  
در پردوش او نہ خورد جز قسم او  
در عریہ چوں بند ز دم باز کشاید  
مرزد خلقی طرے خواہاں ز خم او  
تا بھرہ کشی صفوہ افلاک بود مہر  
بادا کتب دست من و پشت و حکم او

نہر کے صفحہ مضامین "کوب" اور "آباد" "بصر" کھنڈر وغیرہ معیاری رسالوں میں لکھے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لہذا ان کی کوئی تصنیف دستیاب نہ ہو سکی۔

ذیل میں محمد علی حبیب کے "سرجِ عالم" بابت اگست ۱۸۹۶ء (مطوائے

۸۸۵) سے سید احمد شفیق قمر (ایڈیٹر "مردے مٹے") کا مضمون درج کیا جاتا ہے۔

# مرزا اسد اللہ خاں غالب

مر وہم شرح ستم ہائے مریدان غالب  
رم آئندہ طائر جہاں بر خیزد

چوں کہ ہم نے اپنے مضمون کو ایسے شعر سے شروع کیا ہے اس سبب سے ہمیں خیال ہے کہ ”مرقع عالم“ کے ناظرین کہیں یہ خیالی مضمون نہ سمجھ لیں اور کہنے لگیں کہ نیچے خیالی دنیا کی سیر ہونے لگی، یا حسن و عشق کے معشروں میں چاہئے۔ ہم اپنے دوستوں کو اطمینان دلاتے ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے اور خود شعر بھی تو بتا رہا ہے کہ وہ کن واقعات سے ملو ہے۔ اگرچہ ہمیں یہ دھواں تو نہیں ہے کہ ہم کوئی تاریخی مضمون پیش کرتے ہیں۔ مگر ہاں، یہ ضرور کہیں گے کہ اس شعر کے ضمن میں ہمارے احباب کو شاعر کے واقعات اور مختصر حالات سے ضرور آگہی ہو جائے گی اور بحر و اثر الفاظ میں یہ بھی بتایا جائے گا کہ یہ شعر کہاں اور کس موقع پر لکھا گیا تھا اور اس کے جذبات کس قدر سچے ہیں۔ یہ مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب کا مطلق ہے۔ مرزا غالب کا نام آج بزم سخن میں جس اعزاز کا مستحق ہے، اس کے بیان کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

غرض، زمانہ بڑا ہی ناقدوں کا ہے۔ اس نلی چھت کے سائے میں اہل کمال کو ہمیشہ مصیبت ہی کا سامنا رہا۔ شعراے مغرب کا حال الیور گولڈ اسمتھ نے بہت تفصیل کے ساتھ بحر و اثر الفاظ میں لکھا ہے۔ اس وقت ہمیں اس کی تو ضرورت نہیں ہے کہ ہم ان شعرا کا حال الیور کی رہائی تفصیل کے ساتھ لکھیں لیکن یہ ضرور بتادینا چاہیے کہ ہاورد اس کمال کے جو انھیں حاصل تھا۔ سب قاتے کرتے کرتے اور پکیاں پیٹتے پیٹتے مر گئے۔

انگلستان کے شاعر ڈرائڈن، کینرا، ایتالیہ کے ٹیسو، پلوویر، کبھی، فرانس کے



کسٹوری اور پوتانی کے ہومز، ڈس، پائس۔ ان سب کا حال دیکھنے سے معلوم ہو سکا ہے کہ ان پر کیا کیا مصیبتیں بیت گئیں اور زمانے کے ہاتھوں انہیں کن کن ذلتوں سے ساہجہ چلا۔ ایمان کے چادہ نگار شعرا کیلئے ان سے زیادہ بری حالت میں نظر آئیں گے۔ فردوسی، صائری، انوری، حافظ شیرازی بغور دیکھیے تو سب ایک ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور ان نے پردے پردے میں کہا ہے حافظ نے تو صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا:

اسپ تازی شدہ بخر بزر پلاں

اب ذرا اپنے اردو شعرا کا حال سرسری نظر سے دیکھ جائیے۔ میر، جن کو "خداے سخن" کا سہا خطاب دیا گیا ہے۔ کیا تھے اور ان کی عمر کس طرح گزری۔ دلی سے نکلتے جاتے وقت جس قدر داغ جوہر سخن سے بھرا ہوا تھا اس سے زیادہ ان کی آسین اقلان اور تپہ سستی بھری ہوئی تھی۔ غریب کو پھرا کر ایہ بھی نہ بڑا۔ آخر ساٹھے پر گاڑی کر دی۔ انشاء اللہ خان، سودا اور سب سے زیادہ ذوق کو لیجیے جن کو بادشاہ کا استاد بننے کا بھی فخر حاصل تھا۔ جناب ذوق کی حالت ہم سے پہلے کہ کس طرح گزری اور وہ کس قدر اپنی ضروریات سے قانع اور مستغنی تھے۔ اگرچہ ہمیں براہیم ذوق کو دیکھنے کی نوبت نہیں آئی لیکن معتبر ذرائع سے جس قدر ہمیں معلوم ہوا وہ اسی قدر ہے کہ ان کی عمر نہایت تنگ ذوق کی حالت میں گزری۔ ان سب سے قطع نظر کر کے ہمیں مرزا غالب کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ مرزا غالب کے حالات لکھنے کا ہمیں بھج ایک ڈور کے رچنے کے سب سے زیادہ حق حاصل ہے۔ ہمیں مرزا صاحب کی زیارت کا شرف تو حاصل نہیں ہوا، جس کا افسوس ہے لیکن اپنے بزرگان کی رہائی ایسے سچے واقعات ہمیں معلوم ہوئے ہیں۔ جن کا مختصر بیان بھی لطف سے خالی نہ ہوگا۔ جس منہ پر امیر خسرو عرصے تک بیٹھ کر زمانے کو اپنی فخر خلیجوں سے قالہ و دہانہ ہاتھ دے رہے تھے اور پھر دنیا کو چھوڑتے وقت آئینہ کسی کو اس کے لائق نہ سمجھ کر صندوق میں بند کر کے چھوڑ گئے تھے۔ اپنے دور میں مرزا صاحب نے اس صندوق کا

فصل کھولا اور حصہ چھٹی کے ساتھ اسی مسند پر اپنا مبارک قدم رکھا اور سچ پوچھیے تو وہد میں آکر اور مجھ مجھ کر کچھ ایسی دل میں بیست ہونے والی آواز سے مؤثر نغمہ سرائی کی کہ دلی دل کے دلوں ہی میں جا کر ٹھہری اور چاروں طرف سے آواز تھمیں آنے لگی۔ قصائد میں اپنے زمانے کے مستند شاعر مرثی کے قصائد پر مرزا غالب نے جائز نظر ڈالی اور خود بھی اسی طرف جھک پڑے۔ یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ مرثی سے ان کا پلہ بھاری رہا، مگر یہ کہہ دینا بھی سراسر ناانصافی ہے کہ قصائد کی دنیا میں وہ مرثی سے بہت نیچے ہیں۔

مرزا صاحب بہت ہی سیدھے سادے بزرگ تھے۔ مذاق اور ہر دلعزیزی ان کے حواجز میں تھی۔ جناب نواب صاحب دہلی ریاست لوہارو اس وقت بہت کم عمر تھے۔ کبھی کبھی مرزا صاحب کی خدمت میں جاتے رہتے تھے اور مرزا صاحب بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ اکمل فرمایا کرتے:

"سنو مہاں! نواب امین الدین خاں صاحب تمہارے دادا ہیں اور میں تو دل دارہ ہوں۔"<sup>۱۱</sup>

مرزا صاحب کا مکان دہلی میں بلی ماروں کے محلے میں تھا۔ ایک شہر کے امیر زادے سے، جو کوچہ چیلان<sup>۱۲</sup> میں رہتے تھے، مرزا صاحب کو بہت محبت تھی۔ یہ صاحب احتمال سے زیادہ نازک حواجز اور ضعیف الامضاء تھے۔ شام کے وقت گھر سے باہر نکلتے تھے۔ کبھی یا روزانہ مرزا صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے۔ مرزا ان سے کہا کرتے، "کیوں صاحب! ہماری آنکھیں تمہارے دیکھنے کو ترستی ہیں اور تم ایک وقت کے سرفقیر غالب علی شاہ کے نیچے پر تعریف نہیں لاتے۔ گری کے موسم میں قنارت اور حدت آفتاب کی مانج ہے۔ سردی میں زکام اور نزلے کا اندیشہ نہیں آنے دیتا۔ برسات میں تو بجلی کے ڈر کے مارے آپ گھر سے باہر قدم بھی رکھتے ڈرتے ہو۔ میں گرہ کشاں<sup>۱۳</sup> میں رہتا ہوں۔" وہ صاحب سن کے چپ ہو گئے۔ کیوں کہ فی الواقع وہ اپنے حواجز سے مجبور تھے۔ مرزا صاحب کے پاس ایک بلی پٹی ہوئی تھی۔ اس

سے آپ کو بہت محبت تھی بلکہ قاری کے درجہ میں ایک قطعہ بھی لکھا ہے۔ ایک دن گرہِ موت نے اس بلی کا ٹیڑا آدھا۔ جاڑوں کا موسم تھا۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ مینہ برس تھا۔ اندھیری چھائی ہوئی تھی۔ سردی کے سبب سے دانت سے دانت ہنچے تھے۔ آپ نے مکان کا چراغ گل کر دیا۔ پلنگ پر مردہ بلی کو لے کر لیٹ گئے اور خدمت گار کو آواز دی۔ وہ حاضر ہوا تو ہنڑائی ہوئی اور سچی آواز سے کہنے لگے، "میرے کم بجنا۔ کچھ تھکے میری بھی خبر ہے؟" وہ تنک حلال ملازم آج کل کے تنک خوراں کی طرح تنک حرام نہ تھا۔ گھبرا گیا اور بے چینی لگا، حضور کیا ہے؟ آپ نے کہا، "کوئی دم کا مہمان ہوں۔ لال ٹیخن لے جا کوچہ چیلان میں فلاں صاحب کو بلا لا۔ کہہ دیجیو کہ اگر مرزا غالب کو دیکھتا ہے تو میرے ساتھ چلے چلو۔"

یہ کہہ کر کہہ سے ایسی سانس لی کہ ذکرِ دار گیا، لال ٹیخن لے، کھل سنبھال، ہانچا کا پتا ان صاحب کے مکان پر پہنچا۔ کڑی نکھٹائی۔ دروازہ دھمدھماکا اور بے تھاشا چیلے لگا، کڑی کھولو؟

گھر والے دار کھلے۔ انجی، کیا آفت آئی۔ ماما نے ڈیڑھی پر آکر پرچھا، کون ہے کہاں سے آیا ہے؟ خیریت تو ہے؟ ذکر نے کہا۔ میاں کو ذرا بھیج دو۔ مرزا غالب کا ذکر ہوں۔ باقی حال ان سے کہوں گا۔ ماما نے میاں سے کہا۔ وہ غریب بدحواس دوڑتے ہوئے دروازے پر آئے اور کہنے لگے۔ ارے خیر تو ہے! مرزا غالب پر کیا گزری؟ ذکر روئے لگا اور کہا، آپ ہی چل کر دیکھ لیجیے۔ کوئی دم اور راحت کے مہمان ہیں۔ وہ ہامہ اور اہلی دقا لوگ تھے، یہ سن کر بے تاب ہو گئے، ایک ڈنجر اپنے سر پر ہادی اور "ہاے غالب" کہہ کر روئے لگے، حراج کے ہاتھوں بھجور تھے۔ مگر یہ ایسی کشش نہ تھی جو بیٹھ رہے، وہ چار گرم کپڑے اوپر تلے پہنے، پاجامے کا کھنکھٹا۔ پھڑکی لگا، ننگے پاؤں بھیجتے، ٹھوکریں کھاتے ذکر کے ساتھ ہوئے، پاؤں ڈھکی ہو گئے۔ ناغولوں سے غولن ہادی ہو گیا۔ بدحواس اور پریشان مرزا صاحب کے مکان پر پہنچے۔ پلنگ کے قریب جا کر آواز دی۔ غالب! غالب!۔ جواب نہ ملا۔ مرزا غالب، ہاے

ہاں، لگے کچھ تو بولو۔ ایک لڑکھائی اور مذہم آواز میں جواب ملا، کیا ہے؟ وہ صاحب پھر کہنے لگے، آخر بتاؤ تو کیا ہوا؟ آواز آئی، روشنی قریب لاؤ۔ لحاف اٹھا کر دیکھ لو۔ لالہ نین قریب آئی، لحاف اٹھایا تو دیکھا، آپ چت پڑے ہیں۔ ٹی مری ہوئی پڑی ہے۔ وہ صاحب نہ سمجھے۔ پھر پوچھا، کیا حال ہے۔ کہا، دیکھو، یہ ٹی مر گئی ہے۔ ہاں غالب کو صدمہ ہوا۔ یہ کہا اور اٹھ بیٹھے۔

مرزا غالب اسکی ترک تھے۔ بڑے خاندانی اور شریف بزرگ تھے۔ چٹاں چہ ایک قلعے میں آپ لکھتے ہیں:

ہمکم از ہمارا اتراک

در قنای ز باد وہ چندیم

بعض حضرات ہجرت سے فرمایا کرتے ہیں کہ "مرزا صاحب نے تو اچھا زمانہ اور قدردان پبلک پائی تھی۔ مگر وہ اس قدر تک دست کیوں رہے؟" بے شک ایک تلافی کو جس قدر ہجرت ہو، وہ حق بجانب اس کے ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ بعض اوقات ہم خود ہجرت میں آجاتے اور سوچتے ہیں کہ مرزا غالب تو بڑے ہر دلعزیز بزرگ تھے۔ وہ اس قدر پریشان حال کیوں رہے؟۔ اب ایک سرسری نظر مرزا صاحب کے علاوہ کی طرف دوڑائیے۔ اس فہرست میں آپ دلیاں ملک اور سردارانی قوم اور اکثر صاحبانِ اقتدار بزرگان کے نام نامی دیکھیے گا۔ جنت آرام گاہ نواب یوسف علی خاں صاحب دہلی ریاست رام پور سے میرزا صاحب کو جو تعلق تھا، اس کا بیان کرتا طول اہل ہے۔ دو شعر سن لیجیے، آپ جان جائیں گے کہ جنت آرام گاہ سے مرزا کو کیا تعلق تھا۔ فرماتے ہیں:

نواب مر نیر منوچہر چار ما

حاصل جمال یوسف و قرب کلیم باد

ایک شعر چھوڑ کر لکھا ہے:

بر دم ترا شکست دلا و پ بزم افس

روح الامیں صاحب و غالب غلام باد

جنت آرام گاہ کے سوا نواب ضیاء الدین احمد خاں، نواب علاء الدین احمد خاں صاحب بہادر مرحوم و مظلوم، نواب مصطفیٰ خاں صاحب، مرزا فقید وغیرہ کو جو مرزا صاحب سے حسن عقیدت تھا، وہ محتاج یہاں نہیں۔ مگر ہم اپنے ان احباب کی خدمت میں عرض کرتے ہیں جو حقیر ہو کر پوچھتے تھے کہ غائب نے تو ایسا زمانہ پایا۔ پھر کیوں اس اظہار کی مصیبت میں مبتلا رہے۔ جناب ! اگر نظر کرنا کے بڑھا کر اور خیال کو وسیع کر کے دنیا کی عام حالت پر غور فرمائیے گا تو آپ کی حیرت رنج ہو جائے گی۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ہر دور اور ہر عصر میں بادشاہ امیر و وزیر غریب بھی ہوتے آئے ہیں اور دنیا کی یہی رفتار ہے۔ فردوسی نے کیا زمانہ پایا؟ اور اس کے ساتھ عصائری نے، حافظ، انوری جس زمانے میں اپنے جوہر کلام سے دنیا کی عام سوسائٹی کو بے خود کیے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں کیا دنیا بادشاہوں اور دولت مندوں سے خالی تھی؟ ہرگز نہیں اور نہ ایسا ہو سکتا ہے۔ ایسا پھر؟ ہاں، دنیا تو اسی کا چڑا ہے کہ ہر زمانے میں ان صاحبان کمال کی دل بھرتی تھی مگر ہوتی نہیں۔"

اگرچہ مرزا صاحب کے معتقدوں کی فہرست پر آپ کی نظر بھیجی جی ہے مگر مرزا صاحب کی حالت آپ کو اب بھی نہایت سلیم اور قابلِ رحم ہی نظر آئے گی:

فشیخ بیست اگر ہے سر و سلاں زلم

کا نالہ جاں کاہ سننے گا۔ کہیں ترک وطن پر آخر آخر آفسو روتے پائے گا۔ کہیں عزیزوں اور دوستوں کی بے مبری کی داستانِ دل سے پار ہو جانے والے الفاظ میں سننے گا۔ حاصل کلام یہ کہ غریب کو ان ہی داستانِ ہائے فم کے دکھڑوں میں مبتلا پائے گا۔

عام طبائع کے خواہش سے بھی بڑھ کر مرزا صاحب کو دلی سے بیحد وطن ہونے کے نہایت محبت تھی۔ جس طرح مرزا رفیع (سودا) کے تہہ دلی چھوڑنے سے پہلے ترک وطن کے خیال سے مل کھا لیتے تھے، مرزا صاحب آخر تک اسی خیال پر قائم رہے۔ آخر مجبور ہیں کہ ہاتھوں دلی چھوڑنا ہی پڑی۔

کھنڈ بھیج کر جو قصیدہ لکھا ہے ان کے پڑھنے کے بعد آدمی اپنے ہوش میں

نہیں رہ سکا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

چہرہ اعلیٰ و گہرہ و مژہ آغوشہ بنوں  
خود کاہم کہ نہ دلی بچہ عنواں رستم  
اور ایک شعر لکھا ہے جس کا دوسرا مصرع یہ ہے:  
نہ بدل رستم ازاں بھد مل از ہاں رستم  
آگے چل کر لکھتے ہیں:

دارغ حسرت بدل و شکوہ اختر بن ہاں  
صفت از بخت کہ بسیار بہ سماں رستم

مطلعی زبان فارسی سے جن اصحاب کو شوق ہے انہوں نے مرزا نائب کا قاری  
دیوان ضرور دیکھا ہوگا۔ مگر جس جائز نظر سے ان کے کلام کے دیکھنے کی ضرورت ہے،  
شاید اس نظر سے بہت کم اصحاب نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ میں تو اس دیوان کا ایک ایک  
مصرع ٹکڑ و ٹکڑ سے کم نہیں (نہارے وہ اصحاب معاف فرمائیں گے جن کا تخلص فخر یا  
فخر ہے) مگر اس قصیدے کے اشعار میں جو بے خود کردینے والی کیفیت ہے۔ اس کا  
مزہ کچھ عادی دل ابھی طرح لے رہا ہے۔

میرے ایک معزز دوست نے اپنے واجبِ انتظام بزرگ کی لڑائی یہ حکایت  
مجھ سے بیان کی کہ جب مرزا صاحب دلی کو آخری نگاہ سے خیرباد کہنے پر آمادہ ہی  
ہو گئے۔ تو میں نے ان سے، بعد اس تقرب کے جو مجھے مرزا نائب صاحب سے  
حاصل تھا، کہا کہ آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں اور ترک وطن کیوں فرماتے ہیں۔  
اول اول تو عادت کے موافق، ہوں ہاں پر ٹالتے رہے اور جب میرا اصرار حد سے  
بڑھا تو کہا، "کو میاں، تم نے ابوالقروج بن ہندو طیب کا وہ قطعہ بھی سنا ہے جس میں  
اس نے ہدایت کی ہے کہ جب آدمی کو اپنے وطن میں ذلت کا سامنا ہونے لگے تو اسے  
ترک وطن پر آمادہ ہو جانا چاہیے۔" وہ صاحب خاموشی ہو رہے۔

اپنے دوست کی لڑائی میں ایک دوسرا واقعہ بھی بیان کرنا چاہتا ہوں جو انہوں

عالم اور دہلی "مرچ عالم"

نے اپنے عالی قدر بزرگ سے سن کر مجھ سے جان کیا۔ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان دنوں مرزا صاحب کو عطف الکفر کا سامنا تھا۔ میں نے دیکھا تو مرزا صاحب اسی طرح، جو ان کی عادت تھی، ہنس بول رہے ہیں۔ میری حیرت جب حد سے گزرنے لگی تو مرزا صاحب سے میں نے کہا، "جناب، باوجود ایسے معاملات کے روکش ہونے کے میں آپ کو بے فکر دیکھتا ہوں۔"

مرزا صاحب نے فرمایا، "ہاں، خدمت ہے۔ میری جان، میری فکر سے وہ واقعات گزرے ہیں، جن کے خیال کرنے سے آدمی کے دھنیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔" اور پھر فرمایا، "میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ ایک شریف زادے سے، جو جوہر شرافت کے علاوہ ذرا دھوڑ دینا سے بھی مستفی تھا، ایک شخص نے مراسم اتحاد بڑھانے شروع کیے، بلا حاشیے بڑھاتے یہاں تک فطرت بھٹی کہ اپنی بیوی کی بہن سے اس کا نکاح کر لیا جو کچھ سمجھ کر دیا۔ اس غریب خاتون کو جس قدر خدا نے صودت دل فریب دی تھی اسی قدر دنیا کے منظرین کی زیارت سے اسے بے نصیب دکھا تھا۔ اس درمیان میں اس پائی نکاح خود غرض دوست نے اپنا رسوم اتنا بڑھالیا کہ ہمارے نوجوان شریف زادے نے اپنے ذاتی اختیار میں بھی اس کو دخل دے دیا۔ تھو تو بڑا ہے، مگر مختصر یہ ہے کہ اس شخص کے ہاتھوں، جو کسی طرح چندہ دوسرے سے زیادہ کا آدمی نہ تھا، اس شریف زادے کو وہ وہ سببتیں گوارا کرنی پڑیں جن کا جہاں نہیں ہو سکتا۔

مرزا صاحب کے بزرگ عالم شاہ کے زمانے میں دہلی آئے تھے۔ بادشاہ کے دربار میں بہت اعزاز کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ خود مرزا غالب کو دربار گورنر جنرل میں کرسی ملتی رہی۔ طلعت بھوشہ پالا۔ ۱۷۹۶ء میں مرزا صاحب پیدا ہوئے۔ ۷۳ برس کی عمر پائی۔ ۱۸۶۹ء میں انتقال ہوا۔

باوجود اس تنگ ذاتی کے مرزا صاحب نے اپنی وضع کو کبھی نہ چھوڑا۔ ۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ اٹارن کو دہلی کالج کا انتظام فرمایا منظور ہوا۔ تاسن صاحب، جو اختصار معربی و ثانی کے یونیٹس گورنر بھی رہے، اس وقت نیکر بڑی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ

جس طرح عربی کے حدیث کو سوراہہ تھوڑا ملتے ہیں اسی نگوارہ پر ایک غازی کا حدیث مقرر ہو تو اچھا ہے۔ مرزا غالب کا حال سن کر صاحب بہادر نے آپ کو بتایا۔ یہ کوشی پر گئے۔ اطلاع ہوئی۔ صاحب نے کہا، آنے دو۔ مرزا صاحب نہ گئے۔ دوسری دفعہ تاکید ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ میرے استقبال کو صاحب تشریف لائیں تو میں حاضر ہوں۔ خدمتگار کی زبانی سن کر صاحب جتن اٹھا کر باہر آئے اور تعظیم کے ساتھ اندر کوشی میں لے گئے۔ کرسی پر بٹھایا اور کہا، ”جناب جس وقت آپ گورنری صدارت میں تشریف لائیں تو استقبال کے امیدوار رہیں۔ اب تو آپ عازمت کی غرض سے آئے ہیں۔“ مرزا صاحب نے جواب دیا کہ ”میں تو سرکاری عازمت کو باعث ازدیاد عزت ہوتا ہوں۔ اگر میری بیٹی بیٹی بھی عزت میں بھی فرق آتا ہے تو ایسی تو کئی کو سلام ہے۔“ یہ کہا اور اٹھ کر چلے آئے۔

مرزا غالب نے یہ فرما لیا، جس کا مقلع ہمارے مضمون کا عنوان ہے، تھکوا میں کھسی تھی۔ جب وہ دلی کی قائدروانی، انہاب کی بے مہری، اظہار کی دل آزمائی سے دلی چھوڑ کر تھکوا تشریف لے گئے تھے اور وہاں کی قدردان پادری نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لے کر اپنے سروں پر بٹھایا تو مرزا صاحب کے حواس بجا ہوئے۔ کچھ دنوں وہاں رہے اور شعر و سخن، لطائف طرائف سے اپنے میزبان انہاب کی دل جوئی کرتے رہے۔ ایک روز چند زعمہ دل اصحاب جمع تھے اور مرزا صاحب اپنی بحرنا تقریر سے حاضرین جلے کو لہما رہے تھے کہ ایک صاحب نے اپنے کسی ہم راز دوست کی طرف کان میں جھک کر کہا، ”یہ شخص تو ایسا لائق خوش گو اور ہر دل عزیز شاعر ہے کہ اسے آنکھوں میں بٹھایا جائے تب بھی کم ہے۔ افسوس، دلی میں اس قدر بھی صلاحیت نہیں رہی کہ ایسے محبوب روزگار کی قدر کرتی۔ وہ صاحب ابھی جواب بھی دینے نہ پائے تھے کہ مرزا صاحب بول اٹھے، ”کیوں جناب، کیا ارشاد ہوتا ہے۔“ سوال کرنے والے صاحب کچھ کہ مرزا صاحب نے سن لیا۔ عازمت سے کہا، ”محطرت، خیریت ہے“ اور پھر اپنا خیال ظاہر کیا۔ مرزا غالب صاحب سن کر بے تاب ہو گئے۔ ایک شخص ذی سانس



غالب اور رسالہ ”مرتب عالم“

لی۔ دیر تک گردن جھکائے بیٹھے رہے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی سخت نہ برداشت ہونے والے فم کو ضبط کر رہے ہیں۔ آخر نہ رہا گیا۔ پھر بولے، ”مجھ بیچ میری بھ سے زیادہ قدر کرنے والے دوستوں میں جس وقت عالم وجود میں آیا ہوں تو میرے شفقت کرنے والے والدین نے اسی شفقت، اسی محبت سے مجھے رحمت کچھ کر گود میں اٹھایا، جس طرح ہر بچے کے وہ والدین جن کو قدرت سے پہلے مکمل ایسی نصرت غیر مرقبہ عطا ہوئی ہو، اٹھالیتے ہیں۔ زمانے کے موافق ہونے کے سبب سے میرے باں باپ نے دولت کا کھیل دولت کے ڈھیر میں مجھے کھلایا۔ ابھی میں پانچ برس کا تھا کہ میرے باپ مہدالہ بیگ خاں نے جو آصف الدولہ مرحوم کے عہد میں یہاں (کنکنو) بھی آئے تھے، الود کی لڑائی میں اس دنیا سے رحلت کی۔ اس کے بعد سے اپنے چچا نصر اللہ بیگ کے واسطی محبت میں میں پرورش پاتا رہا۔ چند روز بعد میرے چچا بھی مرگے ناگہانی میں مر گئے۔ جاگیریں ضبط ہو گئیں۔ پھر بھی ہزاروں لاکھوں روپیے موجود تھا۔ اب بھی میری نظر نے بہت سے عزیزوں کو اپنے حال پر شفقت کرتے دیکھا اور میں بے فکر رہا اور اسی طرح میں بچپن کی سب ٹھوپی اور خود فراموشی کے زمانے سے نکل کر جوانی کے بارغ کی ہوا کھانے لگا۔ میرے چند روز کے زوشناس دوستوں میرے ان عزیزوں نے، جو فی الحقیقت دولت کو عزیز رکھتے تھے، جو برتاؤ میرے ساتھ کیا میں جان نہیں کر سکتا۔ آہ کس زبان سے جان کروں۔ نہیں، مجھ سے جان نہیں کیا جائے گا۔ بس اسی قدر عرض کر دیتا کافی ہے۔

مر دہم شرح ستم ہائے عزیزوں غالب

رجح امید تانا ز جہاں بر خیزد

”تانا“ کے لفظ پر سننے والوں کا یہ حال ہوا کہ بھلی کی طرح کہنے لگے۔

دوستے دوستے چکیاں بندھ گئیں اور بار بار ہر شخص اس مصرع کے الفاظ کو ذہن میں رکھتا تھا۔

رجح امید تانا ز جہاں بر خیزد

خود مرزا غالب کا جو حال ہوا، اس کے گھٹنے کے واسطے دل چاہیے، وہ بھی

چکر کا نہیں ٹولا دکا۔

اللہ اکبر! کیا بڑا شیر کلام تھا۔ اس وقت بھی اگر دیکھا جائے تو وہی اثر ہے۔  
درا اپنے اپنے دنوں کو دیکھیے۔ الف اف۔ بے طرح دھڑک رہا ہے۔ گلیا ہے کہ  
چھابوں اچھل رہا ہے۔ بے شک، بے واقعات اثر دار الفاظ میں موزوں ہو جانے کے  
بعد بغیر رنگ دکھائے نہیں رہتے۔<sup>۳۳</sup> فقط

خانکسار

اسمہ شلیخ از فریہ آباد



## حواشی

- ۳۱۔ کوپہ چیلان۔ کئی برسوں سے ایک نسل کے واسطے یہ ایک محلہ ہے۔ (تبر)
- ۳۲۔ یہ ایک عرب قبیلہ ہے۔ ایک طبرانی نے جاتے جاتے مرزا سے کہا، اچھا پتا لگہ دیجیے۔ انھوں نے  
”بھڑوچان، شروانی، محلہ لی پارس“ لگہ دیا۔ اس بزرگ نے دہلی نکلا کر کھانے پر کھڑا۔ ”بھڑوچان،  
شروانی محلہ کرپ کھان“ پاسے میں میری قاف کہ یہ کوئی ما محلہ ہے مگر مرزا غالب ایک مشہور آدمی تھے، اس  
سبب سے غلطی کیا۔ (تبر)
- ۳۳۔ میرے نزدیک مرزا صاحب کا مطلب اسی اور صریح ہے بعد سے ہے جو بعد میں پیدا ہوا تھا  
اور ان کے لیے مرزا کا ڈاکو و شہید تھا جس نے ۱۸۵۵ء میں ایک غلط مرض میں مبتلا ہو کر جان دلی۔ یہ حکیم  
پیدا کر دیا تھا۔ شاعری میں اس کو بڑا کمال حاصل تھا۔ اس کے اکثر اشعار مشہور ہیں اکثر انہوں نے اس کی  
تقریب کی ہے۔ اپنی دشمنوں نے، جو اپنی دوسرے کا طبیب تھا اور صریح کی بہت تخریب کرتا رہا۔  
”کتاب صالح“ میں اور صریح کے اقوال سے بہت کچھ دلائل پیش کیے ہیں۔ اس حکیم کے مروج کا زہد اکلیم  
پارسلہ مہاشی کے بعد میں تھا جسے اشعار کے سخی تخریب کے ساتھ مرزا صاحب نے بیان کیے۔ اس کا ترجمہ یہ  
ہے جب تھو کو جیسے ہم دشمنوں سے آزاد پہنچے تو تھو کو زکیم دہلی کر دیا جائے۔ کہیں کہ اپنے دہلی میں عزت  
حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس صریح پر وہ ایک جمل دیا ہے کہ کیا نہیں دیکھا کہ منہلی بھڑوچان میں ایک معمولی  
کڑی کا نام ہے مگر دوسرے نمائک میں وہ کسی جسے قابل قرار ہوتی ہے۔ (اسمہ شلیخ ص ۱۸۴)

غائب اور دہانہ ”سرمچے عالم“

۱۳۔ سلطان محمود غزنوی نے سوجانہ کی قرانی کے ہاتھ بہت دیکھا کہ ہاتھوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور قرانی دالے سے ہر چلے چلے تو کب فوج سے لگ کر پائے دار آواز سے وہ شعر شاعرانہ کے پڑے اور چاہیں کہ تازہ دم نہ رہیں۔ ان قصوں کا اثر یہ ہوا کہ دشمن بھاگ کھڑے ہوئے۔

قبیلہ بنی حنیملہ سے بہت فوجیں کی فوج کا نظام دی تار میں مقرر ہوا تو ایک شہزادہ لڑکی نے صحنہ اس وقت بہت کر لوگ پیدا ہونے والے تھے ایک شعر پڑھا اور گویا عربوں میں بہادری کی روح پھونک دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ فوجیں ہار گئیں عربوں سے ہزیمت اٹھا کر بھاگ گئی۔ یہ شاعری کا اثر نہیں تو کیا ہے۔ (امروہی)



## غالب اور ”العصر“ لکھنؤ

مشہور فلمی اداکارہ جیتا کماری کے تاتا چارے لال شاکر ”العصر“ لکھنؤ کے ایڈیٹر تھے۔ ان کی ولادت میرٹھ میں ۱۳ مارچ ۱۸۸۰ء کو ہوئی۔ ۲۰ فروری ۱۹۵۶ء کو وفات پائی۔ چوں کہ خدمت عیسائی تھے اس لیے پہلا منج دہلی کے قبرستان میں دفن کیے گئے تھے۔

شاکر اردو کے فلم شیدائیوں میں تھے۔ وہ اچھے شاعر، ادیب اور ممتاز صحافی بھی تھے۔ جب میرٹھ میں تھے تو مشہور شاعر اور صحافی شوکت حسین عدت میرٹھی کے شاگرد ہوئے، عدت کے بعد لکھنؤ میں نظر لکھنوی کے علاوہ میں شامل ہو گئے۔ ان کا کام کئی پرانے رسالوں میں میری نظر سے گزرا ہے۔ ان میں ”پردان“ میرٹھ، ”غزل“ لاہور، اور ”ادیب“ ال آباد قابل ذکر ہیں۔ وہ اعلیٰ پائے کے نثری مضامین لکھتے پر بھی قادر تھے۔ موصوف کو اردو کے علاوہ انگریزی اور فارسی پر بھی عبور حاصل تھا۔ طنز و مسکرت اور ہنسی سے بھی کلمہ واقف تھے۔

شاکر کی فلمی اور ادبی شہرت کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ ٹوبہ رائے نظر کے بعد جون ۱۹۱۱ء میں ”ادیب“ ال آباد کے ایڈیٹر ہوئے تھے۔ ”ادیب“ سے قطع تعلق کر کے شاکر نے مارچ ۱۹۱۳ء میں اپنا ذاتی رسالہ ”العصر“ کے نام سے لکھنؤ

میں جاری کیا جو بڑی آب و تاب کے ساتھ دسمبر ۱۹۷۱ء تک لکھا رہا۔ اس پرچے کے کبھی شمارے اردو دسمبرج سینٹر حیدرآباد کے کتب خانے میں میری نظر سے گزرمے چکا۔

"المصّر"، "مخزن"، "لاہور"، "اردوئے معلّے"، علی گڑھ، "دکن راج"، "زمانہ" کان پورا، "لورڈ" "ادیب" کی طرح خالص علمی اور ادبی پرچہ تھا۔ اس میں حدودِ نادر و نادر تصویریں چھپتی تھیں۔ شاعر "المصّر" کے پہلے شمارے میں ایڈیٹوریل میں "کچھ اپنی نسبت" کے ایل میں لکھتے ہیں:

یہ بات بے حائل یقین کر لینی چاہیے کہ میں معمولی استعداد کا آدمی ہوں، نہ تو مجھے زبانِ دانی کا فخر ہے نہ تجربے کا رسی کا اذکار۔ ہاں، چوں کہ گزشتہ دس بارہ سال سے اخباری دنیا سے مجھے خاص تعلق رہا ہے اور اس کا شوق بدستِ اہم دامن گیر ہو گیا ہے اور اسی وجہ سے خیال ہے کہ ملک کے علم دوست حضرات کی بدولت شاید کسی قابل ہو جاؤں۔۔۔ "المصّر" میرا ذاتی پرچہ ہے، یعنی صرف ایڈیٹوری نہیں بلکہ میں ہی اس کا پروڈیوسر بھی ہوں۔ پس اگر ملک نے اس کی قدر کی تو کچھ شک نہیں کہ کم از کم میری حیاتِ مستعار تک "المصّر" جاری رہے گا، انشاء اللہ۔

"المصّر" کو میں نے اپنی سماج کا ذریعہ نہیں بنایا ہے بلکہ اس کو میں مجھ اپنا شوق پورا کرنے کے لیے خالص علمی و ادبی خدمات کی غرض سے شائع کرتا ہوں۔ اس سے جو کچھ آمدنی ہوگی وہ اسی کی بھرتی میں صرف ہوگی۔ ہاں، اس روز کا نہایت بے تابی کے ساتھ انتظار کرتا ہوں کہ میں اپنا تمام وقت اس کو زیادہ بہتر اور کارآمد بنانے کی سعی میں صرف کر سکوں۔

"المصّر" کے قواعد میں تصاویر کا چھپنا ضروری قرار دیا گیا تھا۔ ہر شمارے کی

کتابت و طباعت کا اہتمام نہایت عمدگی سے کیا جاتا تھا۔ اس کا کاغذ بہت عمدہ ہوتا تھا۔ تمام تصویریں دلائی آرٹ ہجر پر چھتی تھیں۔ ایسا صاف ستھرا اور غلطیوں سے پاک رسالہ میں نے بہت کم دیکھا ہے۔ "العصر" کے لکھنے والوں کے چند نام یہ ہیں:

مفسر: علامہ قادری، محدث: میرٹھی، شاعر: میرٹھی، شوق: حماد پوری، مآثر: جانشی، رآتم: رحیمپال سنگھ، شیدا: ایڈیٹر "ہندوستان" لاہور، سید محمد فاروق، جانب: دہلوی، ہاشمی فرید: آبادی، عبداللہ: بہادر دہلوی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ "العصر" کا معیار اشاعت دیاندرائ گم ایڈیٹر "زمانہ" کان پور کو پسند نہیں آیا۔ انھوں نے سرور جہاں آبادی کے کلام "اکسیرِ سخن" کے بارے میں شاعر: میرٹھی پر طرح طرح کے الزامات "زمانہ" پایت آگست ۱۹۱۳ء میں وارد کیے۔ شاعر نے ان الزامات کے جواب نہایت احتیاط پندی سے "العصر" پایت ستمبر ۱۹۱۳ء (ضمیمہ) میں ذیل کے شعر کے عنوان:

زمانہ مجھ کو برا کہہ رہا ہے کہنے دو

میں جانتا ہوں، زمانے کا اعتبار نہیں

کے تحت لکھا ہے۔ مضمون بڑا دلچسپ ہے، چنانچہ گم صاحب کی تردید میں لکھتے ہیں:

اس موقع پر یہ ظاہر کر دینا غلط محاسب نہ ہوگا کہ غالب علی کے

زمانے ہی سے میری طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل تھی۔ ۱۹۰۰ء

میں حضرت شوکت میرٹھی مدظلہ سے تلمذ اختیار کیا۔ مگر نظمیں لکھنے

کا ذوق ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۷ء میں ہوا، اور اس وقت سے "غزل" اور

"زمانہ" اور دیگر رسائل میں نظمیں شائع ہوئیں۔ "تجدد" سرحد کی

ایڈیٹری کے زمانے سے شعر گوئی کا بہت کم موقع ملا، مگر اس

زمانے میں بھی ملک میں میرا تعارف شاعر ہونے کی حیثیت سے

ہو چکا تھا۔ جولائی ۱۹۰۷ء میں میں "زمانہ" کا سب ایڈیٹر و غیر

ہوا۔ اس وقت بھی عشق دیاندرائ گم مجھے شاعر کی حیثیت سے

جانتے تھے۔ قیامِ الہ آباد کے زمانے میں مضمون نگاری ہی میرا ذریعہ معاش تھا۔ مختلف اخبارات و رسائل کو مضامین، نظم و نثر پر معاوضہ دیا جاتا تھا، چنانچہ خود "زمانہ" بھی انہیں پرچوں میں شامل ہے۔ "کوہِ ب" کی ایڈیٹری کے بعد اس سلسلے کو جاری رکھنے کی ضرورت نہ رہی۔

راقم حروف نے شاکر کی کئی نظمیں اور حصہ و مضامین پڑھے ہیں۔ ان کے بحرِ علم سے کسی کو کلام نہیں ہوتا چاہیے۔ میری رائے میں نظم نے "بصر" کی مقبولیت اور اپنی معیار اور چشمہٴ روانہ چٹھک کی بنا پر شاکر پر اثرات لگائے تھے۔

"بصر" کے شماروں میں غالب سے حلقہ جو اہم چیزیں موجود ہیں وہ ہم نے نوٹ کی ہیں، "بصر" کو یہ فکر بھی حاصل تھا کہ اس میں مرزا غالب کی وہ قصود بھی چھپی تھیں، جو کلیات فارسی مطبوعہ ۱۸۶۳ء، مطبع دولکھنؤ میں موجود تھیں۔ "بصر" میں غالب کی قصود سے متاثر ہو کر ارشد قادیانی نے "بصرِ غالب" کے عنوان سے ذیل کی نظم فی اہدیہ بھی لکھی تھی:

## ۲۶۵ ہمیں غالبؔ

"بصر" میں دیکھ کر فی اہدیہ

سانے آنکھوں کے کس کا حکم قصود ہے  
جس کی خاموشی میں بھی اک لڑائی نغمہ ہے  
دیکھنے والے پر طاری ہے ابرار کا نور  
چشمِ بخار کو حاصل ہے زیارت کا سرور  
آہ یہ ہے غالبؔ بخت نصیب غلظتِ آفتاب  
بصرِ اعزازِ ولیؔ تارِ بندھنِ جنت

ہر نظیر اپنی تھا خود اس عالم انہماک میں  
 اور اب خوابیدہ ہے خاک جہاں آباد میں  
 زندگی بھر ہر دم سرسبز مہمانے سخن  
 مرتے مرتے بھی نہ چھوڑا جام و میلے سخن  
 مر گیا لیکن کھوم شوق باقی رہ گیا  
 مٹ گیا پھر بھی دھڑ دھڑ باقی رہ گیا

آوا اے جلوہ فروز روئے زیبائے سخن  
 تو وہ بھٹوں تھا، فدا تھی جس پہ لپٹائے سخن  
 تھ سے اردو کا ہوا روشن چراغ شاعری  
 آسماں پہ ٹوٹنے پہنچایا دماغ شاعری  
 شاعرانہ کیف دے دے کر محام احساس کو  
 تو نے دندہ کر دیا موتی احساس کو  
 تو بہارستان دہدائی کو لایا جوش میں  
 اور کی تحریک پیدا فطرت خاموش میں  
 دل میں جذبات لیلیٰ کا عالم کر دیا  
 روح کو مہنوں انداز تبسم کر دیا  
 فلسفہ رنگ صوف کا عیاں تھ سے ہوا  
 عام فہمیں لطف برداک نہیں تھ سے ہوا

ہاں، بھول، غافل، کروے دہر ما مہتا

وہ جو ہر حرف عالم چیدا

"پہلے" میں "مرزا عالم" کے عنوان سے ایک نظم ۱۲ بند میں طبعی دہلی کی

بجی تھی۔ اس کے علاوہ مائی چائی کی ایک گھیس "سوچوں کی لڑی" کے عنوان سے ہر



غزل حضرت عالم دین ہے۔ پہلا اور آخری بند یہ ہیں:

مٹی کیا ہے ازل میں؟ ایک قسمت، دادگوں وہ بھی  
اسی سے دعا کی داہتہ، لیکن بے سکوں وہ بھی  
جو کچھ سرمایہ عمر وہ روزہ ہے، کہوں وہ بھی  
بساط بلور میں تھا ایک دل، یک نظرہ خوں وہ بھی

سو رہتا ہے یہ اعجاز پیکیدان سرگوں وہ بھی  
یہ کج ہے رستے ہیں عاشق کے دل میں اس قدر اداں  
کہ مانی کے بھول اک کا ہاں ہے خارج از اسکاں  
مگر نئی جگہ سے وہ لفظوں میں شرح حسرت پنہاں  
مرے دل میں ہے عالم شوق وصل و شکوہ جہراں  
خدا وہ دن کرے جب اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی



"المعصر" جلد ۶، نمبر ۵-۶، میں ایک غیر معروف ادیب دنیا عباس صاحب  
دہلوی نے عالم کی ایک غزل کی شرح لکھی ہے۔ چونکہ شرح مفید اور مدلل ہے،  
اس لیے میں دین و دین دین کی جاتی ہے:

## مرزا عالم کی ایک غزل

حسن فزے کی کشاکش سے بچھا میرے اند  
ہارے آرام ہی میں اہل جہا میرے اند

اس شعر میں مستحق کو جس داہتہ سے یاد فرمایا ہے وہ اس دل ہی خوب  
جاتا ہے۔ بھان ملے اہل جہا جہا کا سینہ ایک گھس داہتہ کے لیے وہ لطف دے رہا  
ہے کہ "کسی" اور "کوئی" میں بھی یہ لطف نہ ہوگا۔ کیا جیسا ہیں ہے۔ ماثلاً ملے اور پھر  
اہل دعا کے زمانے میں اپنے اوپر جہا کا ہونا، حسن کے ساتھ فزے کی کدھری کا

چلتا اور پھر اس غمزے اور جفا کرنے میں معشوق کی تکلیف اور حسن کی پابندی اور بعد ازاں حسن کا غمزے کی کشاکش سے آزاد ہونا، معشوق کا، جو جفا کرتے کرتے نگ آگیا تھا، آرام پاتا اور اس کے لازمی نتائج یعنی صرف انھیں کا مورد غمزہ و جفا ہونا اور غیروں پر مہربانی اور لطف کا ہونا (کیوں کہ ان کے مرنے کے بعد جیسی تو معشوق جفا سے اور حسن غمزے کی کشاکش سے چھوٹے گا) معشوق کے واصل تک اور جفا کے عادی ہونے کا یقین (کیوں کہ عادت میں تکلیف نہیں ہوتی اور شعر میں غمزے کی کشاکش اور جفا سے چھوٹنے پر آرام آتا اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ ان کا عادی نہیں) یہ تمام باتیں، جو بالکل نیچرل ہیں، وہ چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں اس خوبی کے ساتھ جمع کر دی ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتی۔

(۲) مصبِ شینگی کے کوئی بھی قائل نہ رہا

ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

اس شعر میں اپنا شیفتہ انداز و ادا ہونا جو صرف انھیں کے واسطے برتے جاتے تھے اور صرف انھیں کا اس مصبِ شینگی انداز و ادا کے قائل ہونا اور ان کے بعد کسی کا واصل قائل نہ ہونا خواہ ظاہر کیا جائے اور اس وجہ سے انداز و ادا کی معزولی کمال جانح طور پر بیان ہونے میں ایک خاص خوبی یہ ہے کہ پہلے مصرع میں انداز و ادا کی معزولی ظاہر کر دیتا بھی ضروری ہے کہ ایک نیچرل بات ہے کہ اگرچہ ایک شخص کے بہت سے عاشق ہوتے ہیں اور سب بھائے خود دل و جان سے اس پر قربان ہیں، مگر ہمیشہ ایک دوسرے کو جھوٹا دعوے وار محبت تصور کرتا ہے اور ہر شخص یہ خیال کرتا ہے کہ معشوق کے تمام جود و قسم میرے ہی اوپر ہیں اور غیروں سے بے حد احتیاط ہے اور وہ ہمیشہ ان کی محبت میں رہتا ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے عاشق دشمن اور معشوق میں بھی ایک خاص ادا کے ساتھ بڑے مفاہت پیدا ہو گئے مگر اس پر بھی یہ انھیں جود و قسم کا، انھیں انداز و ادا کا شیفتہ ہے اور اسی کو غیبت کہہ کر کہتا ہے:

فتح کیجیے نہ تعلق ہم سے کہہ نہیں ہے تو عادت ہی سہی

ہم بھی حلیم کی نحو ڈالیں گے ہے نیازی قری عادت ہی سہی  
 پیچھے خبریں سے پہلی جائے آسہ کر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی  
 (۳) شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے

شعلے عشق یہ پوش ہوا میرے بعد

اس شعر کے پہلے مصرع میں کائنات کا وہ اصول بیان فرمایا ہے جس کو بھی  
 حقیر و مجذول نہیں۔ سائنس دانوں نے لاکھ سرچکا اور ہزار کوششیں کیں کہ وہ اصول  
 دوسری شکل اختیار کرے، مگر آخر امر مجبور ہو کر ان کو بھی ماننا پڑا کہ جب شمع بجھے گی تو  
 دھواں پیدا ہوگا۔ اب دوسری خوبی اس اصول کے بیان میں یہ ہے کہ اپنے مطلوبہ  
 دعوے کے استدلال کے واسطے وہ اصول بیان فرمایا ہے جس کو ہر شخص جانتا ہے، مگر  
 اس کے ساتھ ہی اپنی نکتہ دہی اور ہدایت دہی کا بھی ثبوت دے گئے ہیں، یعنی اسے  
 بڑے دعوے کی دلیل میں وہ بات کہی ہے جس تک ہر شخص کا دماغ نہیں پہنچ سکتا ہے  
 اور یہی استدلالی اور قادر الکلامی کا ثبوت ہے۔ اب قلم نگار شعر کا مطلب بیان ہونے  
 کے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ شمع ایک روشن شے ہے جس میں حرارت ہے اور دھواں،  
 جو قلم نگار ہونے کے جسم شمع میں موجود تھا، عام طور پر سیاہ ہوتا ہے۔ حرارت کا رنگ  
 سرخ ہے (مثلاً غول) مسئلہ طبعی۔ عشق ایک حرارت تھی ہے اور اس کا تعلق خاص طور  
 پر قلب سے ہے جو خود مرکب حرارت جسمانی ہے۔ اس لیے عشق کو شعلے یعنی گرم اور  
 روشن شے سے مثال دی ہے اور خوب دی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عاشق کو حزن و  
 ملال، رنج و الم، ماتم دل، مرثیہ نگار سے کام ہے اور لہاس ماتی سیاہ ہوتا ہے اس لیے  
 عشق ہی کو سیاہ پوش بیان کیا ہے۔ اب دیکھیے کہ شعلے کا سیاہ پوش ہونا کتنا ناممکن تھا۔ مگر  
 اس خوبی سے بیان ہوا ہے کہ گویا یہ سیاہی شعلے میں اسی طرح مضر تھی جس طرح شمع  
 میں دھواں۔ اب مطلب شعر کا بالکل آسان ہے، یعنی کہ میں ہی ایک یادگار عشق تھا۔  
 بعد میرے عشق نے ماتی لہاس نامن کیا اور یہ لہاس نامن کہ شعلے عشق جو سیاہ ہو گیا، یہ  
 کوئی خلافِ نیکر بات نہیں، بلکہ جب شمع گل ہوتی ہے، جب بھی سیاہ دھواں اٹھتا ہے۔

گویا ہر روشنی شے سیاہ ہو سکتی ہے۔ اب یہ کہنا کہ عشق کا جو ماتی لباس ہے یہ صرف میری ہی وجہ سے ہے۔ یہ ایک شاعرانہ محفل ہے، اور بھائے خود یہ بھی ایک خاص لطف رکھتا ہے جو معروض بیان میں بے مشکل آسکتا ہے۔ ان تمام گہرے نکات کے علاوہ شعر میں نہ کوئی تفسید ہے نہ الجھاؤ۔ سیدھے سادے دوزمزمہ میں خدا جانے کیا جادو مجرود ہے کہ دل کے جذبات خواہ مخواہ بڑھ جاتے ہیں۔

(۴) خون ہے دل خاک میں احوالِ بیاں پر، یعنی

ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

اس شعر میں جو محاورہ بانٹھا گیا ہے اس سے کون تاواضع ہے۔ مگر اتنا خوب رکھنا چاہیے کہ اس محاورے کے معنی صرف گل ہونا ہی نہیں، بلکہ بے چین ہونا، بے حال ہونا کا مہاب نہ ہونا، ضائع ہونا وغیرہ بھی لیے جاتے ہیں۔ یہاں پھر یہ محاورہ جس خوبی کے ساتھ بانٹھا ہے وہ محتاجِ بیاں نہیں، یعنی دل کا خون ہونا اس عضو کا خون ہونا جو مرکزِ خون کیا۔ خود ہی خون ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ "جب تک میں زندہ رہا جب تک جیوں، یعنی مستحقانِ جہاں کو یا صرف میرے مستحق کو مہدی لگانے کی ضرورت نہیں ہوئی، کیوں کہ میرا خون ہی ان کے دستِ نازک رنگنے کے واسطے کافی تھا۔ اب جب کہ میں مر چکا ہوں تو کوئی ایسا نہیں رہا جس کے خون سے وہ ہاتھ رنگیں۔ پس جب خون نہیں تو لاچار اٹھیں محتاجِ حنا ہونا پڑا، یعنی مہدی لگانے کی ضرورت درپیش آئی اور اس مہدی لگانے سے میرا دل، جسے خون سے خاص معلق تھا، باوجود خاک میں مل چکنے کے خون ہو رہا ہے، یعنی اس کو قلقل ہے یا بے تاب، بے چین اور مضطرب ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کرب صرف اس وجہ سے ہے کہ میں ان کے ناخن رنگنے کے قابل نہ رہا۔" پہلے مصرع میں لفظ "یاں" بہت سے مستحق یا حسین ظاہر کرتا ہے اور اگرچہ بادیِ انکسار میں بہت سے مستحقوں کا ہونا ممکن ہو ہی اور ہے ہوگی ظاہر کرتا ہے، مگر دراصل اس میں ایک اور خوبی ہے اور اس صیغہِ جمع سے جمع اور واحد دونوں معنی نکلتے ہیں۔ زبان کا قاعدہ ہے کہ کہیں تو گل کے لیے ایک جڑ اور کہیں جڑ کے لیے گل،

کئی طرف کے لیے مطروف اور کئی اس کے برخلاف استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ہم روزمرہ بولتے ہیں پارلوگ وہاں ڈٹے ہوئے تھے یعنی صرف ہم۔ استاد دانش فرماتے ہیں:

نہرنے کی بے وفائی سب کی شامت آگئی  
آگ ہو جاتے ہیں وہ اہل وفا کو دیکھ کر

یہاں "سب" سے مراد عاشق صادق یعنی صرف ذات خاص اور اہل وفا سے بھی مراد صرف "میں" ہی ہے اور کوئی نہیں۔ اسی طرح ہم بھانے چرائے یا پسپ کے صرف روشنی کہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ پس یہاں لفظ "فان" سے مراد صرف ایک مراد مستحق بہ صیغہ واحد ہے نہ کہ کوئی دنیا بھر کے بہت۔ اور اگر ہم اس کو جمع کا صیغہ مان بھی لیں تب بھی اس سے یہ مطلب ہے کہ میں حیثیتاں جہاں کا اتنا بڑا دل دادہ اور ایسا عاشق تھا کہ ہر کسی کی ادا پر جان دینے کو تیار تھا۔ الغرض ہر حسین کا سچا عاشق تھا یہ بھی مرنے والے کا کمال ظاہر کرتا ہے۔ دوسرے مصرع میں بھانے ہاتھ یا کبج دست کے صرف ناخن کا محتاج تھا ہونا ہندھا ہے۔ یہ شاعر کی کمال نازک خیالی کی دلیل ہے کیوں کہ کسی کے گودے گودے لائے لائے ہاتھ بھانے اس کے کہ گل ہفتیلی کو منہدی لگائی جائے صرف انگلیوں کی پردوں کو حتا بہت کرنے سے بدرجہا خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔

(۵) دورِ عرض نہیں جویر بیداد کو جا

نکہ ناز ہے سرے سے تھا میرے بعد

یہ شعر شاعر کے خاص رنگ میں رنگا ہوا ہے اور اگرچہ قاریت اردو پر غالب ہے مگر دراصل اس نے شعر کا لطف دوبالا کر دیا ہے اور شاعری کی گاہ انکسائی اور زبان کی لطافت نے وہ لفظ جمع کر دیے ہیں کہ شعر کو ہزاروں دفعہ پڑھے مگر لطف بڑھتا ہی جائے گا۔ شعر کی خوبی سمجھنے کے لیے صرف عرض اور جوہر کا فرق معلوم کرنا کافی ہوگا۔ جو شے کسی ذات میں قدرتی موجود ہو اور اس سے جدا نہ پائی جائے وہ جوہر ہے اور جو

شے نکسہ ہو، یعنی بعد میں داخل یا باہل کر دی گئی ہو، یعنی عارض کی گئی ہو، وہ عرض ہے۔ مثلاً کپڑے میں تار و پود جوہر ہے اور رنگ عرض ہیں۔ اس مصرع میں عرض کے معنی ظاہر کرنا، مانگ کرنا، پھیلانا وغیرہ ہیں۔ مثال کے طور پر مرزا صاحب ہی کا یہ شعر عرض ہے:

عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گری کہاں

کچھ خیال آیا تھا دھشت کا کہ صبرا جل گیا

اس کے ساتھ ہی ہمیں خمرے کا بھی ایک جوہر ہوتا اور اس کا پھیلنا بھی نظر میں رکھنا چاہیے۔ جب یہ سب باتیں معلوم ہو گئیں تو صاف ظاہر ہے کہ پہلے مصرع کا نتیجہ دوسرے مصرع میں اور دوسرے مصرع کی وجہ پہلے مصرع میں ظاہر فرمائی گئی ہے۔ یعنی خواہ اس طرح کہیے کہ "یہاں کہ جوہر بیداد یعنی مستحق کے علم و حکم کو چک درغور (قابل) عرض نہیں رہی۔ یعنی میرے مرنے کے بعد جب کوئی شخص ایسا ہوتی نہ رہا جس پر اس کا جوہر و حکم برداشت کرنے کے قابل رہا ہو اس لیے اس نے سرمہ لگانا چھوڑ دیا (خفا ہوا، یعنی چھوڑ دینا)۔ یہاں یہ بھی سوال ہو سکتا ہے کہ سرمے ہی میں کیا خصوصیت تھی جو بیان کیا گیا۔ اس کی وجہ مذکورہ بالا دماغوں اور غولہاں جیہاں کے علاوہ کسی دزدیدہ نظر کے چڑکے کھائے ہوئے دل سے پوچھیے کہ کبہ سرمہ آلود کیا انداز کر رہی ہے۔ اس پر طرز یہ کہ شاعر کتہ دس نے ایک اور چکر کہ دیا ہے، یعنی کبہ ناز اور سرمہ آلود۔

دوسرے معنی اس طرح پر کہہ جاسکتے ہیں کہ میرے مرنے کے بعد مستحق نے جو سرمہ لگانا چھوڑ دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی بیداد برداشت کرنے کے قابل کوئی عاشق نہیں رہا۔ اس طرح درغور عرض نہ ہونے سے دو معنی نکلے ہیں۔ ایک طرف تو غایت بیداد (جو بالکل نیچرل طور پر عاشق کو محسوس ہوتی ہے) دوسری طرف اور عاشقوں کی ناقابلیت (یہ خیال بھی نیچرل ہے کہ میرے سوا دوسرے عاشق صادق نہیں ہو سکتے) غرض شعر کیا ہے، خوبیوں کا تحزن ہے یا بلاط کا دفتر۔ واقعی مرزا

صاحب نے شعر نہیں کہا، بلکہ کرامت کی ہے۔

(۶) ہے جنوں اہل جنوں کے لیے آغوشِ وداع

چاک ہوتا ہے گریباں سے جہا میرے بعد

اس شعر میں اچھائے جنوں کی حالت کا وہ نقشہ کھینچا ہے کہ شاید ہی اس سے بہتر بیان ہو سکے۔ مطلب یہ ہے کہ "اہل جنوں کے لیے جنوں آغوشِ وداع ہے، یعنی اہل جنوں کو جب دودھ جنوں ہوتا ہے تو اپنے آپ سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ چاک اور گریبان، ایک ہی پیرا میں کا حصہ ہیں اور اس طرح پر وہ ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ مگر فرماتے ہیں کہ "میرے بعد یعنی میرے آپ سے گزر جانے کے بعد یا دوسرے لفظوں میں مجھ پر جنوں کا دودھ ہونے کے بعد چاک اور گریبان میں جدائی ہوتی ہے، یعنی چوں کہ اہل جنوں دودھ جنوں ہوتے ہی آپ سے گزر جاتے ہیں، میں نے بھی پیرا میں کے ایسے ٹکڑے ٹکڑے اور دھبیوں کر ڈالی ہیں کہ چاک نہیں گیا اور گریبان نہیں۔" فرض اس طرح پر ان میں بھی جدائی دکھائی ہے اور آغوشِ وداع کو بھالا ہے۔ نیز دوسرے مصرع میں پہلے کا ثبوت اور پہلے میں دوسرے کا نتیجہ اس بلاغت سے بیان فرمایا ہے کہ سبحان اللہ!

(۷) کون ہوتا ہے صوبے سے مردِ آگنِ عشق

ہے مکتوبِ لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

اس غزل کے ہر شعر میں اور بالخصوص اس شعر میں مرزا صاحب نے وہ کمال ظاہر فرمایا ہے کہ بادشاہِ اُردو سادے شعر پر نظر دوڑا جائیگا۔ ایک حرف کیا، ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہ جو دوا و دہل کر دیا جائے اور پھر شعر میں جہاں سے دوستی کے موجودہ غریباں بھی باقی رہ جائیں۔ عشق کی مثال سے مرزا آگن سے آگنی ہوگی سے دی گئی ہے کہ بس انہیں کا حصہ تھا۔ کہیں کہ جہاں تک جی چاہے تھرتھایا کیے جائے۔ مگر شراب اور عشق میں ذرا بھی فرق نہ آنے کا اور بالخصوص جب وہ مرزا آگن کی خاصیت کے ساتھ قصوں کو دی گئی ہو۔ اس کے بعد پورے مصرع کو دیکھیے بالکل بھی معلوم ہوتا ہے کہ

کوئی نگاہ کر دعوت دے رہا ہے۔ دوسرے مصرع کے لفظ "مکثور" نے شعر کی خوبی کو اس اعلیٰ درجے پر پہنچا دیا ہے جہاں معمولی خیال کا گزرد نہیں اور اس کے ساتھ ذرا اس پہلو پر بھی نظر رہے جو آپ کے حرج سے مراد لکھی عشق ہونے کا شعر سے نکل رہا ہے۔ کیوں کہ ان کے بعد اس صلا کا ہونا اس بات کی قوی دلیل ہے۔ اب شعر کے معنی بالکل صاف ہیں۔ یعنی میرے بعد جب کوئی شراب عشق کا، جو مرد لکھن ہے، مقابلہ کرنے والا یعنی چیتے والا نہ رہا یا دوسرے معنی میں عاشق صادق نہ رہا تو اب ساقی (مستحق) پر بار بار یہ صدا ہے کہ "چلو حرج سے مراد لکھی عشق کون ہوتا ہے، چلو" اس کے علاوہ لفظ مکثور میں ایک اور خوبی پوشیدہ ہے جو بے حد لطیف ہے اور صرف پڑھنے سے ظاہر ہو سکتی ہے یعنی "مکثور" اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ دو بار آواز نکلتی جا رہی ہے۔ اس میں پہلی آواز کے معنی تو دی ہیں جو جان ہوتے یعنی دعوت۔ اور دوسری آواز یا اس اور امید کی ہے یعنی پہلے آواز دی اور جب کوئی نہ آیا تو خود ہی کہتا ہے کہ بھلا اب کون ہوتا ہے۔ اے، بھان لڈ، بھان لڈ!

(۸) تم سے مراد ہوں کہ انکا میں دنیا میں کوئی

کہ کرے تعویذ میر و دلا میرے بعد

کاغذ ہے کہ جب کوئی مر جاتا ہے تو لوگ اس کے مزاجوں سے تعویذ کرتے ہیں، یعنی شریک رنج و الم ہوتے ہیں اور ایسے موقعوں پر اکثر یہ گفتگو ہوتی ہے کہ اگر کسی کا کوئی مرنے والا تھا تو تعویذ کرنے والے بزرگ اپنے آپ کو اس کی مرہون اور خبر گیری کے لیے پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح جب موقع دینی و بزدلی قتل وغیرہ کا اظہار کیا جاتا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ "جہاں تک میں دیکھتا ہوں، میرے بعد میر و دلا کی تعویذ کرنے والا دنیا میں کوئی نظر نہیں آتا اور اس تم سے مراد ہے مرا جاتا ہوں۔ مرنے سے دونوں معنی لیے جاسکتے ہیں، یعنی ایک تو دراصل مرنا، دوسرے تم سے مرنا، یعنی بے حد غمگین ہونا۔ یہاں پر یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہر عاشق اپنے آپ کو سچا دعوے دار محبت اور نچا دکھانے کہتا ہے اور یہ خیال شاعرانہ نہیں



بلکہ بالکل نچرل ہے۔ مرزا نے اس مطلب کو کہ تمام دنیا کی سرود دعا صرف میری ہی ذات میں جمع ہے (کیوں کہ جب ہی تو ان کے بعد کوئی سرود دعا کا نام لیا بھی نہ رہے گا اور اس طرح اپنے سوا تمام عاشقوں کو ان خوبیوں سے سزا جس نرالے طور اور باگین کے ساتھ بیان فرمایا ہے یہ کچھ انھیں کا حصہ تھا اور فی الحقیقت نچرل جذبات کو اس انداز واداء کے ساتھ بیان کرنا کچھ انھیں استادوں کا نام تھا۔

(۹) آئے ہے نکلی عشق پہ روتا غالب

کس کے گھر جائے گا سیلاب کا میرے بعد

سبحان اللہ! مطلع کیا فرمایا ہے، کمال کیا ہے، صرف دو لفظوں یعنی "میرے بعد" میں تمام یہ مضمون بھردیا ہے کہ اس وقت میں جاے عشق میں جلا ہوں اور عشق کے نیکیوں لوازمات کا میں مورد ہوں۔ ازل تو عشق ہی کیا کم ہے۔ ہزاروں بلاؤں کی ایک بلا اور ہزاروں مصیبتوں کی ایک مصیبت۔ پھر اس کے ساتھ رنج و الم، حزن و ملال، ہجر و فراق، آہ و زاری، بے کسی و بے چارگی، غرض ہر طرف سے سیلاب بلا کا زور شور ہے اور عاشق بے چارہ (یعنی میں) محی عجباً سب کو برداشت کرتا ہے اور آف نہیں کرتا۔ بس فرماتے ہیں کہ "اے غالب! اس وقت تو خیر میں سوچتا ہوں جو عشق اور اس کے ساتھ اس کی تمام مصیبتوں کو برداشت کر رہا ہوں، مگر اس کے ساتھ ہی جب میں اس حالت پر غور کرتا ہوں کہ میرے بعد یہ عشق بے چارہ مارا مارا پھرے گا اور کہیں اس کو چک نہ ملے گی تو بے اختیار روتا آتا ہے۔" ایک معمولی بات تھی کہ میرے بعد کوئی عاشق صادق یا عشق کی مصیبتوں کو برداشت کرنے والا نہیں رہے گا، مگر اس کو اس لطافت اور خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ مضمون میں جان ڈال دی ہے۔ بھلا اس سے زیادہ لطیف زبان اور جذبات قدرت کا بیان کیا ہوگا۔

مغربی شاعری کو آج کل عام طور پر "نچرل" اور اس دراصل نچرل شاعری کو "عزب اخلاق انشائی شاعری" کہتے ہیں۔ مگر انھوں نے ان کہنے والوں کی آنکھوں پر عجب کی عینک چڑھی ہوئی ہے جو گج اور جلا میں فرق نہیں لگاتی یا ہی روشنی کے

آنتی ٹیوشن کا چشمہ لگا ہوا ہے جس کی وجہ سے ان کی آنکھیں چند صیانتیں ہیں اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ وہ کبھی ایسی لفظی نہ کرتے اور اب بھی اگر تھوڑی دیر کے لیے جینک اتار ڈالیں اور ذرا انصاف سے دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ دراصل دونوں نیچرل ہیں۔ ایک (مغربی شاعری) میں وہ باتیں ظاہر کی جاتی ہیں جن کا ہمارے ظاہری حواس میں سے کسی نہ کسی سے کچھ تعلق ہے اور دوسری (انڈیائی شاعری) میں نیچر کے اعلیٰ جذبات اس مؤثر پیرائے میں بیان ہوتے ہیں جن کو صرف دل و دماغ ہی محسوس کر سکتے ہیں۔"

☆

## حاشی

۱۲۱ "سوہی" نے "سوہی" سے مصلحتاً غم کرنے کے سبب جو خیرنامہ "سوہی" کے حوالہ سے ۹ دسمبر ۱۹۱۲ء کو لکھا جو دسمبر سال تذکرہ ہی کے شمارے (صفحہ ۶۷۶) میں شائع ہوا تھا، اول میں درج کیا جا رہا ہے

"سوہی" کا یہ سیر ہے ذات انگریزی کا آخری لبر ہے اور اسی لبر کے ساتھ میرا قلم تعلق رہا ہے۔ میں نے ایک ہی سات ماہ "سوہی" کی جو کچھ لکھی یا میری خدمت کی ہے وہ اعلیٰ فکر سے لگی تھی۔ جو کچھ مجھ سے ہوتا اعلیٰ ہوتا تھا میں نے اس میں کوتاہی نہیں کی اور میں نہایت غلطیوں کو بھی اپنے ناچ خدمات کا اعتراف میری امیدوں سے بڑھ کر ہوتا رہا ہے۔ اس سبب پر بھی اپنے تمام میراؤں کا دل شکریہ ادا کرتا ہوں جو اپنے لکھنے کا ساتھ میں سے میری امداد کرتے رہے اور میری امیدوں کا بھی جو دیا تھا میری ناچ خدمات کا اعتراف کر کے میری عزت افزائی فرماتے رہے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ بھی ان کی فکر میری "سوہی" پر مہذب رہے گی۔ مجھے امید ہے کہ جدید انتظام اور مواد کی مسلسل ترقیات سے "سوہی" کو اور زیادہ فروغ حاصل ہوگا۔

میں ان تمام عزتوں سے مددگار دل کے ساتھ خواست ہمار سہلی ہوں جن کو میری کسی گریہ کنی فکر سے کی ہو ہے، جو امانت میرے قلم سے لگا ہو، صدمہ بخلا

ہے۔ انہیں بڑا چھوٹا چھوٹا کر ختم دے کے مگر ایسی گھوڑوں کا جو جانا ہیہ از  
انسان ہیہ۔ میں اس امر کی بھی درخواست کرتا ہوں کہ آئندہ "گھوڑ" کے حلق  
کسی قسم کی غلط و تکلیف سے نمونہ نام پر نہ کی جائے۔ بلکہ حسب قاعدہ غلط و تکلیف  
نام بغیر صاحب "گھوڑ" طریق پر لکھ آتا ہو۔ اس اصطلاح پر خصوصیت کے  
ساتھ لکھ کیا جائے۔

ہوا آئندہ حلق کیا ہوگا؟ اس کے حلق میں نے ابھی یہ کہہ چھوٹا نہیں کیا۔ حاصل  
کہ وہی آدم کر کے کا ہوا ہے۔ بھر جائے۔

اب تو جانتے ہیں بہت کوسے سے میر

ہر جلی کے اگر خدا لایا

خاتم۔ چارے لال شاگر (میر جلی)

۹ دسمبر ۱۹۶۳ء

نائب کی اس تصویر کے بارے میں "گھوڑ اخبار" میں ذکر کیا گیا ہے۔ تصدیقات کے لیے "مرزا  
نائب اور "گھوڑ اخبار" کا ذکر ہے۔ تصویر میں نائب دربار کی لباس میں بیچ دار بکری دانہ کے گھڑے ہیں۔  
اتھ میں ایک قرع ہے اور انداز گھوڑی ہوا ہے جسے وہ دربار میں اپنا قصیدہ سناتے ہیں۔ یہ تصدیقات مئی ۱۹۶۳ء  
میں کھپ چکا تھا۔ تصدیقات کے بعد "بھڑ" گھوڑ میں شاگر میر جلی نے تاریخ کیا۔



## غالب اور رسالہ ”ادیب“ الہ آباد

قیام حیدرآباد کے زمانے میں راقم حروف کو جناب محمد مہداحمد کے بے نظیر کتب خانے اردو ریسرچ سینٹر میں اردو کے بے شمار نادر و نکم باب رسالے دیکھنے کا اتفاق ہوا، جن کی تعداد کم و بیش ۳۳ ہزار ہے۔ بہت سے رسالوں کی کئی کئی کاپیاں موجود ہیں۔ مشہور رسالوں میں ”نثرین“، ”زمانہ“، ”اردوئے معلّے“ علی گڑھ، ”مرقع“ ہردوئی، ”اردوئے معلّے“ دہلی، ”ادیب“ قریم آباد، ”تفسیر و پختہ“ الہ آباد، ”ادیب“ لاہور، ”ادیب“ الہ آباد، ”العصر“ لکھنؤ، ”معیار“ لکھنؤ، ”سہیل“ علی گڑھ، ”شکب نظر“ لکھنؤ قابل ذکر ہیں۔ رسالوں کا سب سے بڑا ذخیرہ نکلیں موجود ہے۔

”ادیب“ الہ آباد جنوری ۱۹۱۰ء میں جاری ہوا تھا اور ساڑھے تین سال کے بعد اس کی اشاعت جون ۱۹۱۳ء<sup>۱</sup> میں بند کر دی گئی۔ اردو کے مشہور صحافی، شاعر، ادیب اور ناقد مفتی نوب رائے تقر لکھنؤی (م۔ ۱۹۴۳ء) سترہ ماہ (مئی ۱۹۱۱ء تک) ”ادیب“ کے پہلے ایڈیٹر رہے۔ ان کے بعد پیارے لال شاکر میرٹھی (م۔ ۱۹۵۶ء) جون (۱۹۱۱ء) سے دسمبر ۱۹۱۳ء تک ایڈیٹر ہوئے۔ آخر میں سید محمد قاسم رامپوری حسیہ عظیم آبادی (م۔ ۱۹۴۴ء) نے جنوری سے جون ۱۹۱۳ء تک ”ادیب“ کی عوامی ادارت سنبھالی۔ اس کے بعد کا جگہ ”ادیب“ کا کوئی شمار نہیں دستیاب نہ ہو سکا۔ ”ادیب“ ایک اچھا اور

معیاری رسالہ تھا۔ اس میں تصویریں بھی مسموم ہوتی تھیں۔ ”عالم“ کے لکھنے والوں کی تعداد کثیر تھی، جن میں سے یہ لوگ قابل ذکر ہیں: علی حیدر نعم علیہ السلام، شوق قدوائی، قادر (تھکر) کھنوی، باور کا کوڑی، شاہ انگیر اکبر آبادی، حبیب الرحمن خاں شروانی، حکیم برہم، شاکر میرٹھی، حسرت عظیم آبادی، سید محمد فاروق شاہ عظیم آبادی، ماء عظیم آبادی، یاس عظیم آبادی، منوہر لال دت، بٹن نرائن ڈر آہر، شیو نرائن جیم، محمد شفیق خاں مراد آبادی، اکبر اللہ آبادی، پچکوست کھنوی۔

”عالم“ مابین جولائی ۱۹۱۴ء (ص ۱ تا ص ۱۰) اور ستمبر ۱۹۱۴ء (ص ۱۰۹ تا ص ۱۱۰) میں چارے لال شاکر میرٹھی کا مضمون ”مرزا غالب دہلوی“ دو قطعوں میں شائع ہوا۔ اس سے قبل اگست ۱۹۱۱ء کے شمارے میں غالب کے شکستہ حصار کے بارے میں موصوف نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔ جولائی سالہ مذکور (۱۹۱۳ء) کے شمارے میں ڈاکٹر اقبال اور شوق قدوائی کی معرکہ آرا نظمیں ”مرزا غالب“ اور ”عالم“ صفحہ ۳۹ اور ۴۰ میں چھپی تھیں۔ نظمیں یہ ہیں:

## ۱۔ مرزا غالب۔ اقبال

کلمہ انساں پر تری ہستی سے ہے روشن ہوا  
ہے جو مرثیہ خلیل کی رسائی کا کما  
روح تھا خ اور تھی بزم سخن بکھر ترا  
زبب سخن بھی رہا مصلحت سے پنہاں بھی دیا  
وہ میری آنکھ کو اس نفس کی مٹھور ہے  
صورت روح و رواں ہر شے میں جو مستور ہے

خلل ہستی تری پہلو سے ہے سراپا دار  
جس طرح جڑی کے پھول سے سکوت کو سدا  
میرے فردوس خلیل سے ہے قدرت کی بہار  
میری کشف فکر سے اچھے ہیں عالم سبز دار

دہلی مضر ہے میری شوقِ تحریر میں  
 تاب گویائی سے جنبش ہے لبِ قصور میں  
 نعل کو سوزاں ہیں تیرے لبِ اعجاز پر  
 جو حیرت ہے شوقِ راجع پر دہان پر  
 شاید مضمونِ تصدیق ہے جیسے اعجاز پر  
 خندہ زنا ہے غنچہ دلی لگی شیراز پر  
 آہا تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے  
 گلشنِ دہلی میں حیرا ہم نوا خواہیدہ ہے  
 طلبِ گویائی میں میری ہم سری صکن نہیں  
 ہو حقیقت کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نہیں  
 ہائے اب کیا ہوگی ہندوستان کی سرزمین  
 آہا اے نگارہ آموز نگار تھک ہیں  
 گیسوے اردو ابھی ملت پہنچے شانہ ہے  
 شمع یہ جھنڈا دل سوزی پر دہانہ ہے  
 اے جہاں آباد اے گہوارہ علم و ہنر  
 ہیں سراپا ناکِ خاموش تیرے بام و در  
 ذوقے ذوقے میں جیسے خواہیدہ ہیں خمس و قمر  
 یوں تو پاشیدہ ہیں میری خاک میں لاکھوں گہر  
 دن تھو میں کوئی لڑ روزگار ایسا بھی ہے؟  
 تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبِ دار ایسا بھی ہے؟

## ۲۔ عالمِ عرب۔ شوق

عالمِ گلِ فضاں کے گل۔ جس سے ہے آبِ آبِ درد  
 رنگِ کلامِ دیکھ کر رنگِ دہلی شبابِ درد

عز کی گری ہواں، جس سے ہے آفتاب سرد  
 حکم میں کھڑے سرد، جس سے شراب تاب درد  
 عین کلام اس قدر، جس سے ورق ورق مس  
 نور عیاں اس قدر، جس سے عرق عرق ہمیں  
 معنی و لفظ کی یہ شکل، نہ ہو سخن میں جس طرح  
 نور نظر میں جس طرح، لطف سخن میں جس طرح  
 لہو ہوئے میں جس طرح، حرف دہن میں جس طرح  
 نکلے ہوئے میں جس طرح، روح بدن میں جس طرح  
 شمع لگا سے ہو بھل، دیہۂ ناز آفریں  
 چوٹی مٹا پہ کہہ اٹھے آئینہ ساز "آفریں"  
 سخن بیاں کو "کتاب آج"، فکر ہے حیرے نام پر  
 خلق سے ہو حکیم کو دھڑکے کلام پر  
 حیرے سادہ حکم کو فوق اودھ کی شام پر  
 تجویز خام، حیر دست، نچر ہے حکام پر  
 شاہ قلمرو سخن، تیرا حکم جہان میں  
 جام ترا بلند ہے مثل علم جہان میں  
 دین بزم علم و فن ہے تو تری رقم سے ہے  
 عین گل زمین شعر ہے تو ترے حکم سے ہے  
 دامن بحر، بے گھر، حیرے بے کرم سے ہے  
 حکم معوی میں جاں، تری دیاں کے دم سے ہے  
 قوت حر سامری آئی تری دہان پر  
 بول اٹھا کلام خود جان چڑی دہان پر  
 صبر حکم حضری، حیر دہان کے ساتھ ہے  
 نور عیاں انوری، حیرے بیاں کے ساتھ ہے

عزیز، بریک سوچ، طبع رواں کے ساتھ ہے  
 حسنِ کلام، مثل لب، تیرے دہاں کے ساتھ ہے  
 قوتِ مطلق کی شاں، نطق سے تیرے باہر مکی  
 اوج سے ہر زمیں شعرو، عرش بریں پہ پہنچ گئی  
 کم امدادی کی قلم رزم، تیرے کلام نظم میں  
 نظمِ غلامیہ کی شاں تیرے نظام نظم میں  
 حوتِ فلک سک کی طرح، ہے تیرے دامنِ نظم میں  
 مستیِ فہم کے لیے نئے تیرے جامِ نظم میں  
 لوحِ ہمیں عشق و حسن، تیری رقم کے بس میں ہے  
 طائرِ مددہ کی دہاں، تیرے قلم کے بس میں ہے  
 تیرے قلم کا ٹھیک وصف ہے تو دہاںِ دواز ہے  
 تیری رقم کا دائرہ، دینا نیم ہار ہے  
 تیرا بیان عشق و حسن ہامیہ فقر و ہار ہے  
 عشق کا دل گداز ہے، حسن کا دل نواز ہے  
 قلبِ سستی سخن، جس سے نہ ہو کلام ست  
 کثرتِ جستی سخن جس سے سخن تمام چست  
 اپنی خلست سے نجوم، کا میں ہیں شررِ فلک  
 سوزشِ دل کے ساتھ ہے شمسِ زمیں پہ در فلک  
 کما کے چہچہ ہوا شاخِ شجر شررِ فلک  
 دامنِ صف پہ نگر بس کے ہے ٹو کمر فلک  
 نثر پہ بل رہے ہیں لب، نظم پہ بل رہے ہیں لب  
 پھول کھلا رہے ہیں لب، لعل آگل رہے ہیں لب  
 تیرا معبود سرج، میر پہ کچھ رک گیا  
 رخ جو گیا زمیں کے رخ، رخ سے آسک گیا



نوسے فلک چلا تو کیا، صرف سر فلک گیا  
 بلکہ خداے پاک کے پردہ راز تک گیا  
 قلب میں آئے ہر دم، قلب کے زور جلب سے  
 سلعے کو سب وہ دے دیے فلک نے لے کے قلب سے  
 ہر شے نور حسن، خط ترا خود گواہ ہے  
 سلعے پہ ہے سوار خط یا شب نیم ماہ ہے  
 نقشہ نون ہے داغ ماہ نون پہ شکل ماہ ہے  
 نقشہ نون ہے یوسف اور نون کا حلقہ چاہ ہے  
 حیرا قسم ادا شمس، حسن کی ہر سرشت کا  
 زانچہ کھینچا ہے وہ عشق کی سررشت کا  
 فطرت اگر ہے قفل تو کلک ترا کلیہ ہے  
 صحن نگاہ کے لیے حسن راقم نوید ہے  
 رنگ ترے کلام کا، رنگ رباع امید ہے  
 نور تری بیاض کا، شہد کج امید ہے  
 آنکھ میں حیرا لفظ لفظ، مردوب کیا شوق  
 شوق سے جڑی شوق پوچھ، شوق ہے خود گواہ شوق

### ۳۔ مرزا غالب دہلوی۔ (شاکر میرٹھی)

یہ بڑے نال شاکر میرٹھی (ایڈیٹر "ادیب") کا طویل مضمون ہے۔ ہم اس کی کلیں مختلف کے الفاظ میں درج کرتے ہیں:

ادیب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ غالب ایسا بیکار اور نامور شخص، جو نظم و نثر  
 پر پورے طور پر قابو رکھنے کے باوجود اسے عقل کی سر آفرینوں کی  
 ایک زبردست مثال بھی تھا، ادیب زمانہ کی بے وفائی اور

تقدردانی اور ایسے وطن کی غیر کمال اندیشی سے ہمیشہ مفلوک و محتاج رہا اور افکار و شعور اور ترقی و ترقیات معاشرے سے اسے بہتکل کسی دن اطمینان حاصل ہوا تو ہمیں اپنے ایک مردہ اور اندھی قوم ہونے کا خیال پختہ ہو جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ غالب کے عہد میں اسلامی حکومت عالمِ نزاع میں تھی اور اسلامی سوسائٹی پر باہم اور بار و فلاکت کی گنتا چھاری تھی لیکن ان حکم رانوں کے لیے جن کی فضول غریبی اور پیش پستی نے بالآخر سلطنت کا دیوالہ ٹکال دیا، یہ ناممکن نہ تھا کہ غالب کو کم از کم حکم برداری کی فکر سے آزاد کر دیتے۔

یہ بات ضروری ہے کہ "قدرِ مردم بعد از مردن" اور شاید اس عہد میں جب کہ کم تعلیم اور خیالات اور افراد میں نقص اور کوتاہ نظری پیدا ہو جانے سے غالب کی رعبِ شان کو لوگوں نے نہ سمجھا ہو، لیکن مغربی تعلیم کے فیضان سے مستفید ہونے کے بعد جب کہ ہم میں اصلی و نقل کی تیز آگئی ہے، ہم کون سا وطنی تقدردانی کا دریا بہا رہے ہیں۔ بے شک، مغربی لٹریچر کے رموز آشنا ہونے کے بعد ہم میں سے اکثر غالب کی عظمت کو جان گئے ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ جب تک غالب کا دیوان اور ان کی قبر اس مبتدل حالت میں رہے گی کہ اس ہونے سے نہ ہونا بہتر ہے اس وقت تک ہم اسلامی برہنہ کے دربار میں نمایاں جگہ پانے کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

غالب کیا تھے؟ اور ان کی شاعری کس درجے کی ہے؟ ہوں جن زمانہ ترقی کرتا جائے گا اور ہمارے خیالات و جذبات میں صلاحیت پیدا ہوتی جائے گی ان کی ذاتی منزلت اور ان کی شاعری کے مدارج پر روشنی پڑتی جائے گی۔ وہی سے کہ آج تک اردو شاعری نے کئی درجے طے کیے ہیں۔ لیکن درجہ بدرجہ اصلاح و ترقی کے سہا پہا، نتائج پر غور کرنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ غالب ایسا فطرتِ شمسِ سخن کو آج تک پیدا نہیں ہوا۔ یہ ممکن ہے کہ کسی ایک صاحبِ کلام میں ان کا درجہ کسی سے کم ہو، لیکن اردو

شاعری پر کثیر کا فقیر بننے کا جو انعام حاکم ہو رہا تھا اگر اس کا کچھ ازالہ ہوا ہے تو غالب کے دماغ و قلم سے۔ خیالات کی ہڈت اور مضامین کی تازگی کی جو روح انفرادی کیفیت غالب کے کلام میں موجود ہے وہ کہیں اور منتقل ہونے لگی۔

غالب کی نظر وسیع اور بلند تھی۔ ممکن نہ تھا کہ ان کی آنکھ اردو کی پست حالت پر نہ پڑتی۔ وہ ایجاد پسند تھے۔ تقلید سے وہ اس قدر متنفر تھے کہ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ کوئی اور شخص بھی اسد گلشن کرتا ہے تو آپ نے اپنا گلشن اسد سے بدل کر غالب رکھ لیا۔ اس حالت میں یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی ان غیر معمولی قوتوں سے کام نہ لیتے جو فطرت سے ورثہ ہوئی تھیں اور جن کے ذریعے سے اردو شاعری میں انقلاب آتا مقدر تھا۔ بے شک وہ پرانے دھرم سے جدا نہیں چلے لیکن انھوں نے اپنے اچھوتے عقل کے زور سے ثابت کر دیا کہ اردو شاعری میں ابھی بہت کچھ اصلاح و ترقی کی گنجائش ہے۔

خانمائی محنت اور نسبی فضیلت کے لحاظ سے غالب کا پایہ بہت بلند تھا۔ وہ ایک قوم کے ترک تھے اور ان کا سلسلہ قرہ بن فریدوں تک پہنچتا ہے۔ سلجوقوں کے استراخ کے بعد ان کے پڑ بزرگوار ہندوستان آئے۔ شاہ عالم کا زمانہ تھا۔ اس وقت سے سلطنت کا صرف اڑھائی باقی تھا۔ تاہم ان کو فوج میں ایک عہدہ مل گیا۔ شاہ عالم کے بعد شہر سلطنت کا تختہ الٹ گیا اور میرے ابوہر ابوہر ہو گئے۔ غالب کے والد مرزا مبدلہ بیک کو علاقہ معاش کی ضرورت ہوئی۔ اس وقت لکھنؤ مغل شاہان روڈگار کے خیال میں منزل مقصود تھا۔ نئی داتا آصف الدولہ کے خواب کرم سے انھیں بھی کچھ عرصے تک رجزہ بیتی کا موقع ملا۔ پھر وہاں سے نواب نظام علی خاں کے عہد میں حیدرآباد وارد ہوئے جہاں انھیں ایک فوجی خدمت مل گئی لیکن آپ و دانہ وہاں بھی نہ تھا۔ بعض خانہ جنگیوں کی بدولت انھیں حیدرآباد کو بھی خیر باد کہا پڑا۔ واپس آکر چندے آگرہ میں ٹھہرے اور پھر رہا بخار و تھک والی اور کے یہاں ملازمت پائے اور وہیں ایک سر کے میں کام آئے۔ راج گڑھ میں مدفون ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ غالب نے اس وقت کی سوسائٹی کا رنگ خوب بھانپ لیا تھا۔ پھر وہ ناقدوں سے حوصلہ افزائی کی کیا امید کر سکتے تھے؟ اس کے علاوہ بادشاہ کو بھی جانتے تھے کہ اس کی وقعت شاہِ ظریف سے زیادہ نہیں۔ وہ بہت بڑے ظرف کے آدمی تھے۔ انسان ساری تکالیف برداشت کر سکتا ہے مگر بیعت کی آگ نہیں بجھا سکتا۔ اس سے وہ بگور ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا جو قصور بہت دینیہ مقرر تھا وہ بھی سلطنت کی بے انتظامیوں اور قتال کی غفلت کاریوں سے انھیں وقت پر نہیں ملتا تھا ورنہ یہ کہنے کی ضرورت باقی نہ ہوتی:

میری گھڑا جو مزر ہے اس کے لئے کا ہے جب بھار  
دم ہے مردے کی چہرہ مایہ ایک خلق کا ہے اسی چلن پہ ہمار  
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیہ حیات اور چہرہ مایہ ہو سال میں دو بار  
میری گھڑا کیجئے ماہ پہ ماہ  
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

انسان کا فطری غرض ہے کہ وہ اپنے کاموں کی داد طلب کرتا ہے۔ شہرت پسندی اور فرائض سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ غالب نے بھی، باوصف زمانے کا حال ہمدے طور پر جاننے کے، بہادر شاہ سے اس بات کی تمنا کی تھی کہ شاہجہاں نے عظیم کو حکم و قدر سے وزن کیا تھا۔ آپ میرے کلام ہی کو عظیم کے کلام کے ساتھ تول لیں۔ اللہ! کیا حسرت بھری خواہش ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ زمانے کی ناقدی نے اس شاعر بے بدل پر مایوسی اور حسرت نصیبی کا کس قدر گہرا نقش بٹھادیا تھا۔ اپنی چیز کو کون برا سمجھتا ہے اور کون اپنی نیکی چاہتا ہے اور اس پر غالب ایسا خوددار شخص! وہ اپنے آگے عظیم کیا مسمیٰ، کسی کو کچھ نہ سمجھتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی دماغ سازی اور ہکرکاری کی داد ملنا محال ہے تو بھی تمنا کی کہ کاش ان کا کلام ہی عظیم کے کلام کے مقابل میں لایا جائے۔

شاہی تحریک، گوجنٹی مسخوں میں برائے نام ہی کیوں نہ رہا ہو! اتنا ضرور تھا

کہ اس کے سبب سے عالم کو ایک طرح کی بے فکری تھی۔ عذر کے ہنگامے کے بعد یہ تعلق قطع ہو جانے پر وہ کچھ شکست و مسرت کا اظہار نہیں کئے۔ ادھر بادشاہ کی طرف سے جو دیکھ بھل مقرر تھا وہ بند ہو گیا۔ ادھر برقی گورنمنٹ سے جو پائلن ملتی تھی وہ بھی بعض شکوک کی بنا پر مسدود ہو گئی۔ باپ دادا کی کمائی اور تانہال کی دولت پہلے ہی پھوگی جا چکی تھی۔ اب کیا تھا۔ نام اللہ کا۔ ایک جگہ خود لکھتے ہیں:

اس ناداری کے زمانے میں جس قدر کپڑا، اوڑھنا بچھونا، گھر میں  
تھا، سب بیچ کر کھایا گیا۔ گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور  
میں کپڑا کھاتا تھا۔

دو سال تک اپنے ہی قول کے مطابق کپڑے کھا کھا کر بسر کی۔ تا آن کہ رام  
پار کے شریف پرورد اور ظم دوست نواب یوسف علی خاں مرحوم نے، جو فوجی شہر گوئی میں  
بھی مہارت تھے رکھتے تھے اور عالم کے شاگرد بھی تھے، ان کا سو روپیہ ماہانہ کا احترام  
دیکھ بھل مقرر کر دیا، جو ان کے آخر دم تک جاری رہا۔ عالم بھی نواب رام پار کے استاد  
تھے، اس لیے گرامی قدر شاگرد انھیں بہت عزت کی نظر سے دیکھتا تھا اور دونوں میں  
نہایت بے تکلفانہ روابط قائم تھے۔ نواب جنوں کے معارف پرورد اور شرفا نواز بھی تھے، اس  
لیے عالم کی توقیر بدینہ کمال طوطا خاطر رہتی تھی۔ میر مہدی بھروج کے نام ایک خط میں  
اس باب میں وہ خود روٹی ڈالتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

قرارداد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ  
دواں مہینا ہے۔ سو روپیہ مجھے ماہ بہ ماہ بھیجتے ہیں۔ اب میں جو  
وہاں گیا تو سو روپیہ مہینا بھام دھوت اور دیا، لیکن رام پار میں ہوں  
تو دو سو روپیہ پاؤں اور دلی میں رہوں تو سو روپیہ۔ بھائی سو دو  
سو میں کلام نہیں، کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و  
شاگردانہ دیتے ہیں۔ مجھ کو ذکر نہیں کھیتے۔ ملاقات بھی دوستانہ  
رہی۔ معاف و تعظیم، جس طرح احباب میں رسم ہے، وہ صورت

حکومت کی ہے۔

دام چار کا وظیفہ اور سرکاری پٹنیں ہندو سات سو روپے سالانہ کے، جو ان کے بچا کی خدمات کے سلسلے میں ان کو اور دوسرے درجہ کو ملتی تھی اور جو تین سال تک بند رہنے کے بعد دفعہ شہادت ہونے پر بدستور پھر جاری ہوگئی تھی، یہ دونوں رقمیں اس قدر تھیں کہ قائب حکومت دہلی کی سرکسکتے تھے، لیکن ان کے خیالات بلند اور ہاتھ کھلا ہوا تھا، ہمیشہ ملک دہلی کی مصیبت میں مبتلا رہے اور عسرت نے کبھی بچپانہ چھوڑا۔ اس کے ساتھ وہ مختلف طبعیت واقع ہوئے تھے۔ ان تکالیف کو خیال میں نہ لاتے تھے اور اس مالی غمرانی سے انھیں سمجھتے تھے کہ بیچانی تک میل نہ ہوتی تھی۔

قائب کے بعد دوستوں اور شاگردوں کی معقول تعداد تھی اور یہ ان کے آڑے وقت میں ہمیشہ کام آتے رہے۔ خود کے بعد جب انھیں فاقہ کشی کی نوبت آئی تھی تو جن لوگوں نے ان کی خبر گیری کا بار اپنے سر لیا وہ ان کے بعد احباب تھے۔ مسلمان اس ہنگامے کے بعد ایسے کھوئے گئے تھے کہ خود اپنی خبر نہ رکھتے تھے، اور ایک طرح سے دہلی مسلمانوں سے بالکل غائب تھی۔ اگر بعدوں نے قائب سے ہمدردی نہ کی ہوتی تو معلوم نہیں انھیں کیا حالت پیش آتی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کس درجے خوش گوار تھے۔

بعد شاگردوں نے اپنے استاد کی خدمت کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ ان میں سے اکثر انھیں مستقل امداد دیتے تھے، جیسا کہ "نروے سلسلے" کے اکثر خطوط سے ثابت ہوتا ہے۔ قائب بھی ان کو اپنی اولاد سے زیادہ سمجھتے تھے۔ وہ حریص و حاجت مند تھے، لیکن ان کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ شاگردوں کی پیش کش کو وہ کس بے تکلفی سے قبول کرتے تھے۔ گویا وہ خود انھیں کا تھا۔ دیکھیے، مٹی ہر کوپال تختہ کو ایک خط میں کس اسلوب سے لکھتے ہیں:

سو روپے کی بھڑی وصول کر لی۔ ۲۳ روپے داروئے کی معرفت  
اٹھے تھے وہ دیے۔ ۵۰ روپے کل میں بھیج دیے۔ ۲۶ باقی رہے۔

وہ بکس میں رکھ لیے، خداتم کو بیجا رکھے۔

خود کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی زندگی کو انہیں آلام و تکلیف کا مجموعہ تھی اور زمانے کی بے وفائی اور ہمتداری کے ساتھ ان کی فضول فریبی دینے پرستی سونے پر سہاگے کا کام دے لگے۔ اداسی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھا۔ شعور کے درجے پر پہنچنے نہ پائے تھے کہ چکا ملاقت کر گئے۔ دلی میں آکر رہے۔ بادشاہ نے عہد معاش کے طور پر تاریخ نویسی کا کام ان کے ذمے کیا اور یہ ۵۰ روپے ماہ وار پائے گئے، لیکن بہت جلد انھیں اس سے ہاتھ دھونا پڑا۔ خود میں بین جملہ اور مصائب کے چھوٹے بھائی وفات کا حادثہ ایسے عالم میں واقع ہوا کہ جب نفسی نفسی کا عالم تھا میرزا یوسف ان کا نام تھا اور ۳۰ برس کی عمر سے وہ بھجوں ہو گئے تھے۔ جب غالب دلی آئے تو انھیں بھی امراء لیتے آئے تھے۔ ۵۵ء کے ہنگامے میں یہ ایک ہذاکانہ مکان میں رہتے تھے اور وہیں انتقال کیا۔ اس وقت نہ کفن کا کپڑا مل سکا تھا، نہ غسل و کور کن تھے۔ انھیں کے مساجد نے جیسے جیسے تھپڑ و پھینکی کی رسم ادا کی۔ غالب کو ان سے بے حد محبت تھی اور انھیں بہت چاہتے تھے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

دی مرے بھائی کو حق نے اوسر نو زندگی

میرزا یوسف ہے، غالب! یوسف عالمی مجھے

اس حادثے کا اثر غالب پر ناگفتہ بہ پڑا۔ انھیں اس کس پیری اور بے کسی کی موت کا اور بھی حقیقی ہوا۔ اولاد کی جانب سے بھی غالب بہت بد قسمت تھے۔ سات بیٹے ہوئے، لیکن زندگی کسی نے نہیں پائی۔ زین العابدین خاں عارف کے (جو ان کی بیوی کے بھائی تھے) دونوں لڑکوں کو، جنھیں صغریٰ ہی میں قیدی کا داغ اٹھانا پڑا تھا، آغوش میں لے لیا تھا اور ان کے ساتھ قایت اللہ کرتے تھے۔ یہ دونوں ہونہار اور صاحب اقبال تھے، لیکن غالب کی ولادت کے بعد ہی یہ دونوں بھی زمین مقنوناں شباب میں گزار گئے۔

زین العابدین خاں عارف، جن کا مرنے والا بیٹا غالب کے بڑے بھائی تھے

نہایت درد انگیز چیز ہے، نہایت خوش فکر و نازک خیال خن کو ہے۔ غالب ان کو بے کی طرح چاہتے تھے۔ ان کا حسرت ناک فہم اس بات کی کافی دلیل ہے کہ ان کی جرات مندی غالب کے لیے فی الواقع غیر حوالہ صیبت ثابت ہوئی ہوگی۔ غور کیجیے، یہ اشعار کس الم آئیں کیفیت اور قیامت آفریں حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور  
تھا مکے کیوں؟ اب رہو تھا کوئی دن اور  
جاتے ہوئے کہتے ہو، قیامت کو نہیں کے  
کیا طرب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور  
ہاں، اسے فلک ہوا جہاں تھا ابھی عارف  
کیا حیرا نکرتا، جو نہ رستا کوئی دن اور  
تم ایسے کہاں کے تھے کمرے داد و سند کے  
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور  
مجھ سے قصیں غزلت سخی، خیر سے لڑائی  
بچوں کا بھی دیکھا نہ تھا شا کوئی دن اور  
ناداں ہو، جو کہتے ہو کہ کیوں پہتے ہو غالب  
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

ان ناگزیر صدموں اور دہشتی افکار اور ان کی بے اعتدالی نے، وقت سے پہلے، غالب کے دل و دماغ کو ضعیف اور قوی کو مستعمل کر دیا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ مردان خانے سے بھٹک کر میں جا سکتے تھے۔ چلتا پھرتا بہت کم کردیا تھا۔ عمل سامت کی صلاحیت بڑھ گئی تھی۔ ان غلیظوں کے مقابلے میں اگر وہ اپنی موت کے ہر وقت منتہی رہتے تھے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

خواجہ عزیز الدین صاحب مزج لکھنوی، جو اس وقت اپنی عام شہرت اور اعتبار قابلیت کی بدولت، قاری کے بہترین شاعر کی حیثیت سے مستحق من الوصف ہیں۔



عالمِ ہندوستان سے اپنی ملاقات کا حال میں بیان فرماتے ہیں۔ چونکہ ان واقعات سے عالمِ ہندوستان کی اخیر عمر کے حالات پر صحیح اور بیک روشنی پڑتی ہے، اس لیے یہ خاص طور پر دلچسپ ہیں۔ جناب مرتزہ فرماتے ہیں:

ایک مرتبہ ہم کھنڈو سے کھمبہ جارہے تھے۔ اتفاق سے کھنڈو کے لیے دہلی اتر پڑے۔ سڑکے میں قیام کیا۔ پھر اسٹیشن پر جانے کے لیے اتر گئے۔ اس سے کھنڈو سے کھنڈو کی دہلی آئی تھی کہ ایک ہم کو مل گیا تھا کہ حسن اتفاق سے دہلی آنا ہوا تو میرزا عالم سے بھی ملاقات کر لیتی تھی۔ فورا جلی ماروں کا محلہ دریافت کر کے جانے کو مستعد ہوئے۔ کچھ دور چل کر لوگوں سے پتا دریافت کیا۔ اس میں ایک صاحب ملاقاتی مل گئے۔ خیریت پوچھنے کے بعد کہنے لگے، چلیے، میں مرزا صاحب سے ملاقات کر دوں۔ مرزا صاحب کا مکان پتہ تھا۔ ایک بڑا چھانک تھا، جس کی بھل میں ایک کمرہ اور کمرے میں ایک چارپائی چھٹی ہوئی تھی۔ اس پر ایک ٹیبل، کچھ ادبی، کھدی رنگ، اتنی بیانیہ برس کا ضعیف العمر، لیٹا ہوا ایک بچہ کتاب پڑھ رہے تھے، ان کے آنکھیں گڑبڑ سے پڑھ رہے تھے۔ یہ مرزا عالم دہلی میں جو گھانا عالم دہلی کا تھی ملاقات فرما رہے ہیں۔ ہم نے سلام کیا، لیکن بھرے اس قدر تھے کہ ان کے کان تک آواز نہ گئی۔ آخر کھنڈو سے کھنڈو دہلی آئے کا قصد کیا تھا کہ عالم نے چارپائی کی پٹی کے سہارے کھنڈو دہلی اور ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے سلام کیا، بمشکل چارپائی سے اتر کر فرش پر بیٹھے۔ ہم کو بھی اپنے پاس بٹھایا۔ علم دان اور کاغذ سامنے رکھ دیا اور کہا ”آنکھوں سے کسی قدر سوچتا بھی ہے۔ لیکن کانوں سے بالکل سنا ہی نہیں دیتا۔ جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب کھنڈو۔“ نام و نشان پوچھا۔ ہمارے ساتھ جو صاحب گئے تھے، ہر چند انہوں نے تعارف کرانے کی کوشش کی، مگر بے سود ہوئی۔ جب ہم نے نام پتا لکھا تو کہا، ”مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہو، تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہو گے۔ کچھ اپنا کلام بھی سناؤ۔“ ہم نے کہا، ”ہم تو آپ کا کلام مبارک زبان سے سننے کی غرض سے آئے تھے۔ بہت دیر تک اپنا

کلام سنا دیا کیے۔ پھر اصرار کیا کہ تم بھی کچھ سناؤ۔ ہم نے یہ مطلع سنایا:

میر مصر است دایم از دھبکہ مہتابے کہ من دایم

دلچا کو رسد از حسرت خواہے کہ من دایم

عجب لطف اور دھڑ سے اس مطلع کو دہرایا اور حد سے تعریف کی۔ پھر آدمی

سے کہا، "کھانا لاؤ۔" ہم سمجھے، یہ بیابان مہمان نوازی تکلیف کر رہے ہیں۔ کھ دیا کہ ہم

صرف تھوڑی دیر کے لیے دہلی اتر پڑے تھے۔ ریل کا دقت بالکل قریب ہے اور کبھی

سراے میں کمزری ہے۔ اسباب بندھا ہوا رکھا ہے۔ پا بہ رکاب آپ سے ملنے آئے

تھے۔ اب اجازت چاہتے ہیں۔ کہنے لگے، "آپ کی غایت اس تکلیف فرمائی سے یہی

تھی کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں۔ ضعف کی جانب دیکھی کہ اہلنا بیضنا

دھواں ہے۔ بھارت کی حالت دیکھی کہ آدمی کو پہچانتا نہیں ہوں۔ سلامت کی کیفیت

ملاحظہ کی کہ کوئی کتنا پیچھے چھو کو خبر نہیں ہوتی۔ غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا۔ کلام سنا،

اب ایک بات باقی رہ گئی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں اور کتنا کھاتا ہوں، اس کو بھی ملاحظہ

کرتے جائیے۔" اسنے میں کھانا آیا۔ دو پھلکے اور ایک طشتری میں بھنا ہوا گوشت، جس

میں کچھ میوہ بھی پڑا ہوا تھا۔ پھلکے کا ہار یک بہت لے کر، دو چار نوالے بمشکل کھائے اور

کھانا بڑھا دیا۔ قہقہہ ہوتا ہے کہ اس مقدمہ طوراک پر کیوں کر بسر کرتے ہیں۔

مرنے سے کئی برس پہلے چلنا پھرنا موقوف ہو گیا تھا۔ اکثر اوقات

پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ غذا کچھ نہ رہی تھی۔ چہرہ، سات

سات دن میں اجازت ہوتی تھی۔ طشت چمک پلنگ کے پاس ہی

کسی قدر اونچل میں لگی رہتی تھی۔ جب حاجت معلوم ہوتی تو پردہ

ہو جاتا تھا۔ آپ بغیر استعانت کسی نوکر چاکر کے کپڑے اندر کر

بیٹھے ہی بیٹھے نکلتے ہوئے چمک پر پہنچتے تھے۔ پلنگ پر سے چمک

نک جاتا، چمک پر پڑھتا، چمک پر دیر تک بیٹھتا اور پھر چمک سے

اتر کر پلنگ تک آتا ایک بڑی حوصلہ طے کرنے کے برابر تھا۔

(”یادگار غالب“، سطر ۹۹-۱۰۰)

اس عالم میں بھی خطوط نویسی کا سلسلہ قائم تھا۔ جس روز انتقال ہوا اس سے شاید ایک دن پہلے نواب علاء الدین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا۔ اس کے جواب میں ایک فقرہ اور ایک غازی شعر، جو خانقاہ شیخ سعدی کا تھا، لکھوا دیا۔ فقرہ یہ تھا: میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں مسایوں سے پوچھتا۔ مرنے سے پہلے یہ شعر دروداں رہتا تھا:

دم دانیں بر سرِ راد ہے  
عزیز، اب اللہ ہی اللہ ہے

اس انصاف ناک اور پر صعب حالت کا اندازہ کیجیے اور پھر ان کا یہ شعر پڑھیے تو حیرت کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھج جاتی ہے اور اس عالم ہستی کے مصائب کا نقش دل پر گہرا جم جاتا ہے۔ کس مایوسی اور اربابان کے ساتھ کہتے ہیں:

زندگی اپنی جب اس فعل سے گزرتے غالب  
ہم بھی کیا یاد رکھیں گے کہ خدا رکھتے تھے

۲۔ ان مصیبتوں کے خاتمے کا وقت آگیا اور ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو اس جہان فانی سے رگڑاے عالم جاودہانی ہوئے۔ غالب کی ولادت جب ہشتم ماہ ربیع المرجب ۱۲۱۲ھ کو ہوئی تھی۔ اس حساب سے ۷۳ برس اور چار مہینے کی عمر پائی۔ حضرت سلطان نظام الدین قدس سزا المعویز کی درگاہ میں مدفون ہوئے۔ ”آء غالب برہ“ کا تاریخ وفات ہے۔

غالب ذاتی حادثات و خصائص کے لحاظ سے ان تمام اصناف کا دل پذیر مجموعہ تھے جو ایک شریف اور وضع دار آدمی کی زندگی کا جزو لاینفک ہو سکتی ہے۔ اخلاق، مروت، فراخ دلی، انکسار، عفو و بخشش، نیک عزائم، یہ صفات ان میں پدیدہ اتم موجود تھیں۔ ان تمام باتوں کے ساتھ وہ انجما دوسرے کے خوددار تھے۔ ان کی زندگی خواہ کبھی ہی گزری ہو، لیکن انھوں نے کسی سے دپ کر ہاتھ نہیں کی۔ خاندانی عزت کو آخر وقت تک تباہ نہ

اپنے نئے والوں سے ٹوٹ کر پلٹے تھے۔ کسی کا تہذیبی برتاؤ گردن کو بھی جھکا نہیں سکتا تھا۔ اپنی آن کو وہ بھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے اور بھی کوئی بات ایسی نہ کرتے تھے جس سے ان کی وقعت میں کمی آنے کا احتمال ہو۔

سٹر کلائو کے اثاثوں میں چند روز لکھنؤ میں بھی رہنا پڑا تھا۔ ضیاء الدین حیدر کا زمانہ تھا۔ رؤسا و محام بہت خاطر سے پیش آئے۔ روشن العودہ سے بھی، جو نائب سفارت تھے، ملاقات کی صورت نکل آئی تھی۔ لیکن محض اس وجہ سے محض طور پذیر نہ ہوئی کہ نائب نے ان کے حلقے پر وہ شرطیں پیش کی تھیں کہ:

(۱) نائب میری تعلیم دی اور (۲) میں نذر سے صاف رکھا جاؤں۔

مرآت کا یہ عالم تھا کہ مشکل سے انکار کا لفظ ان کی زبان سے نکلا۔ جو شخص غریب بزرخی اصطلاح لانا، اسے بھی مایوس نہ کرتے۔ آخر میں بھی جب کہ آنکھوں سے پھٹائی بھی رجحان ہو چکی تھی، خط و کتابت اور اصطلاح کلام کا سلسلہ جاری تھا۔ دوستوں کے حلقہ مراہب کا انھیں بہت خیال رہتا تھا اور چوں کہ وہ بہت فراخ مشرب واقع ہوئے تھے، اس لیے ہر کس و نا کس سے بلا تفریق عقائد ملتے تھے۔ شاگردوں سے انھیں پدرانہ انسیت تھی۔ اہل دیال کے حقوق کا بھی کما حقہ خیال رکھتے تھے۔

شراب نوشی کی مذموم عادت انھیں ضرور تھی۔ لیکن اس کے نقصان کے وہ خود تائب تھے۔ ان کے بعض خیالات میں اہلاد کی جھلک، ہادی انظر میں، موجود ہے لیکن وہ صوفی مشق اور صاف دل شخص تھے۔ طراحت کا مادہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اکثر ان کے شہسوار استیلا کو لوگ ہر واقعی سمجھنے سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ سچ نہیں۔

مظہر یہ کہ جب غریبی کے آدمی تھے۔ ایسے پاک نفس لوگ روز بروز نہیں پیدا ہوتے۔ نائب کی موت سے جہاں ہندوستان کو ایک نامور شاعر کو ہٹا دیا، وہاں اردو شاعری کو ایک بے غرض محسن اور حقیقی سرپرست سے ہاتھ دھو ہٹا دیا۔ اگر نائب کو کچھ جھگڑائی میں حاصل ہوا ہوتا اور چند روز ہالیناں کھلے ہوتے تو معلوم نہیں کہ ان کی دماغی سرآفرینیاں، اردو ادب میں کن کن جواہر ریزوں کا اضافہ کرتیں۔ بے شک، ایک طرف

ہم بدھنصیب ہیں اور دوسری طرف ہماری شاعری، جسے سہاگ ہی میں سوگ کے پڑے  
نصیب تن کرنے پڑے۔

عالمِ ادب کی شاعری کی عظمت کا اندازہ کچھ دینی لوگ پورے طور پر کر سکتے ہیں  
جنہیں مہدءِ قیام سے ذاتی سلیم اور وہدائی مکی کا مکتبہ بہ حصہ ملا ہے۔ ایسے ہمارے  
نقص میں فطری طریقے سے وہ تمام قوتیں موجود ہوتی ہیں جن کی امداد سے وہ اپنی  
کوششوں کو کارآمد اور ضرورتِ ہمت کے عین مطابق بنا سکتے ہیں۔ عالمِ ادب کے زمانے تک اردو  
شاعری ایک احز سے پر پل آ رہی تھی اور اس میں ہمت کا پہلا تقریباً مکتوبہ ہو چکا تھا۔  
جو راک صدیوں سے الپے چارہ تھے انہیں نئے نئے سامعین کی بے لطفی بڑھاتی تھی۔  
نئے گئی تھی۔ ایک ہی فقرہ تھا کہ ہزاروں صفحوں میں چاہا جا چکا تھا۔ اس میں وہ ڈانٹے مطلق  
باقی نہ تھا جس سے دماغ اور روح کو کوئی مسرت پہنچ سکتی۔ عالمِ ادب کی دور بین نظروں نے  
اس نقص کو شاید پہلے ہی دریافت کر لیا تھا اور انہیں کامیاب طرزِ سخن کی تقلید کی ذمہ داری  
ڈالنے کی ضرورت ابتداء ہی میں محسوس ہو چکی تھی۔ اس لیے انہیں اپنے لیے ایک جداگانہ  
راستہ تلاش کرنا پڑا۔ پہلی نیک کا چھوڑنا کوئی آسان بات نہ تھی اور اس کام میں انہیں  
غیر معمولی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہاں ہم ان کی معنی آفریں طبیعت اور ذہن و سما  
نے ان کے لیے بالآخر ایک ایسی شاہ راہ پیدا کر دی، جسے مولانا حالی تو پرانے راستے  
کے محاذی سمجھتے ہیں، لیکن ہم اپنی ناچھڑا سہ کے مطابق اسے صراطِ مستقیم خیال  
کرتے ہیں۔

اصلاح کے معنی، ہماری نگاہ کے مطابق، یہ ہیں کہ کسی چیز کے خاص و محبوب  
کو دور کر کے اس کی ضرورت کے مطابق غریبوں کو جمع کر دیا جائے، نہ یہ کہ چیز کی اصلی  
ہیت ہی نہ ہوتی رہے۔ اگرچہ کہ صورتِ اصلاح نہیں، بلکہ ایجاد کبی جا سکتی ہے۔ ہم  
عالمِ ادب کو اردو شاعری کا موجد تسلیم نہیں کرتے، بلکہ مصطلح یا ریکارمر، اور حقیقت یہ ہے کہ  
انہوں نے اردو شاعری کی قدیم خصوصیات قائم رکھنے کے ساتھ ہی اس میں وہ تحریکات  
پیدا کر دی ہیں جو کسی شے کی ذاتی اور اصلاح میں ظہور پذیر ہونا لازمی ہیں۔

غالب کو سب سے بڑی وقت جو اپنے مشن کی کامیابی میں پیش آئی ہوگی وہ عوام الناس کی مخالفت ہوگی۔ لوگوں کا مذاق شروع سے بگڑا ہوا تھا اور وہ حسن و عشق کے ان سوچناوت جذبات سے لذت پذیر ہونے کے عادی بنے ہوئے تھے جنہوں نے اردو شاعری کی بدنامی میں آج تک بڑا حصہ لیا ہے۔ ہماری پارے میں عاشقانہ شاعری، بشرطے کہ طرز ادائے مطالب میں احتمال مد نظر رہے، کو لگی بڑی چیز نہیں۔ بلکہ اس سے وہ بچی اور قدرتی کیفیتیں حشرح ہوتی ہیں جن سے محاذ ہوئے بغیر خوب انسانی کو چارہ نہیں۔ لیکن شریکان طرز بیان کی جگہ جب بازاری زبان میں عشق و محبت کی تصویر کشی جاتی ہے تو وہ نہایت ذلیل و کمزور چیز ہو جاتی ہے۔ عشقی مولانا دم میں آپ عشق کی مؤثر حسیہ دیکھ کر ذرا جان صاحب کے دیوان پر نظر ڈالے تو پاک ہذبات اور ناپاک ترین خواہشات کا فرق بین دریافت ہو سکتا ہے۔ نیز مؤخر الذکر سے ہمارے خیالات کی بستی اور ہماری معاشرتی لڑائی کا صحیح اندازہ بھی ہو سکتا ہے۔

غالب نے جب آنکر کھول کر دیکھا ہوگا تو انہیں اپنا ہم خیال شاید ہی کوئی نظر آیا ہو اور پھر جب بے یار و مددگار انہوں نے اپنا کام شروع کیا ہوگا تو نہ معلوم کس کس قسم کی مخالفت کے طوفان سے مقابلہ کرنا پڑا ہو۔ بعض تذکروں میں اب تک ایسے واقعات کا ذکر موجود ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخالفوں نے کس کس طریقے سے غالب کی چلتی گاڑی میں روڑے اٹکانے کی کوششیں کی ہیں۔ لیکن مشاہیر کا خاصہ طبیعت ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی چیز کو اپنے ارادے میں سب دیا نہیں سمجھتے اور جس بات کو وہ غور و فکر کے بعد اچھا سمجھ لیتے ہیں اس کی ذمہ سے پھر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ غالب بھی ذہن کے بچے تھے۔ ورنہ ان کی کوششیں عام مذاق کی لڑائی کا اندازہ بد وقت کر سکتیں۔ بہر کیف، غالب کامیاب رہے اور عزم و استقامت کے ہاتھوں انہوں نے چارچ اردو میں عظمت و شہرت کے ذرا پانچواں نقوش چھوڑے ہیں جو ہمیشہ اپنی ضد فطرتی سے ان کا نام چمکاتے رہیں گے اور آنے والی نسلیں کو ان کے درجے کاموں سے باخبر کرتے رہیں گے۔ کامیابی کی یہ جلیں اور دیوانہو شاعری کی یہ نظیریں صرف انہیں لوگوں میں پائی جاتی ہیں جن کو

قدرت کی طرف سے اپنی اوصاف دہائی و فانی رویت کیے جاتے ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عالم کے دماغ و ذہن میں بھی فطرتاً وہ باتیں موجود تھیں جن کے بغیر انسان کے لیے منزل مقصد پر پہنچنا مشکل اور ہر حال ہوتا ہے۔

عالم کے بچپن میں تعلیم کا جو معیار مقرر تھا وہ آج کل رائج نہیں۔ وہ علوم و عمل رہا ہو یا نہیں؟ لیکن اس کے کام آمد و ملید ہونے میں شک نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عالم کو قدیم طریقے کی پابندی کے باوجود بھی عربی کی تعلیم نہیں دلائی گئی۔ صرف و نحو کی معمولی ابتدائی کتابیں لکھ کر نظر سے گزر گئی تھیں۔ فارسی تعلیم خواہ کسی درجے تک ہوئی ہو، لیکن اس میں کلام نہیں کہ عالم کی فارسی زبان کی لہجہ و انتہائی رچے کی تھی اور ہندوستان میں فارسی کا بغیر لسان امیر خسرو اور فیضی کے بعد عالم کے پائے کا شاید ہی نظر آئے۔ فارسی اہل ہونے کی وجہ سے انھیں اس کا اکتساب یوں بھی آسان تھا۔ حسن اتفاق سے انھیں استاد بھی ایک پاری خواہ ملا۔ جس کی تاثیر تربیت نے عالم کو کچھ کا کچھ کر دیا۔ انھیں فارسی زبان پر جو عبور اور قدرت حاصل تھی اس کا ایک شہ ان کے فارسی کلام سے ظاہر ہو سکتا ہے۔ الفاظ کا استعمال، محاورات کی صحت، زبان دہائی وغیرہ اس کے الفاظ سے وہ فارسی کے بہترین ادیب اور مستند ماہر کہے جاسکتے ہیں اور اسی دستاویز کی جھلک ان کے اردو کلام میں بھی موجود ہے۔ خصوصاً ان کا ابتدائی کلام اردو جسے دیکھ کر حاضنین نے سہل کہہ دینے میں بھی جامل نہیں کیا۔

عالم کا مروجہ ادبی و ریختہ اصلاح شدہ حالت میں ہے۔ مولوی فضل حق صاحب خیر آبادی کی رائے سے اس میں سے ادبی اور بہت اوزہم اشعار حذف کر دیے گئے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے وہ اشعار اس میں شاد و نادر ملتے ہیں، جنھیں طریق طبع اشخاص بے سنی خیال کرتے تھے۔ تاہم سوچنا وہ چار شعر موجود ہیں۔ جو وقت پابندی کا بجائے خود کامل ثبوت ہیں:

فعل فریادی ہے کس کی شوئی تحریر کا      کاغذی ہے حق من ہر جگہ تصویر کا  
یک قدم وحشت سے درک دگر امکاں نکلا      ہمارے اڑائے وہ عالم وحشت کا شیرازہ تھا

ہوے سب گل آئینہ ہے مہرِی قافل کہ اعادہ بخوں غلطی نہ کھل چاند آیا  
 رنگِ گلشنِ صبح بہارِ نظارہ ہے یہ وقت ہے شگفتہ گہاے ناز کا  
 پہلا شعر جو اردو دیوان کا سرِ مطلع بھی ہے، معنی کے اعتبار سے طبعی حلقوں میں  
 آج تک بابِ النزاع ہے۔ اسی قسم کے ادنیٰ کلام کو دیکھ کر کسی نے یہ طعن آمیز شعر کہا ہے  
 کلامِ میر کجے اور دیوانِ میر دا کجے مگر ان کا کہا ہے آپ سمجھیں، یا خدا کجے  
 مخالفوں کے طعن و تفتیح کا جواب اگرچہ غالبؒ نے اس شعر میں نہایت خوبی  
 سے دیا ہے اور کج یہ ہے کہ اہل کمال اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں:

نہ سنا کش کی تنہا نہ صلے کی ہوا مگر نہیں ہیں سرے اشعار میں معنی نہ کسی  
 لیکن اس استغناء کے باوجود انھیں اپنی روش کی اصلاح کرنی پڑی۔ کسی مجبوری  
 سے نہیں، بلکہ طلبِ خاطر۔ چنانچہ درمیانی عمر کے کلام کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ  
 فہمِ الفاظ کی کثرت اور مطلب کی پیچیدگی تقریباً منقود ہو گئی ہے۔ قاری ترکیبیں اور  
 محاورات چوں کہ زبان پر چڑھے ہوئے تھے، اس لیے ان کا ترک یکایک فی الجملہ دشوار  
 تھا، لیکن اس بات میں شب وہ احتیاط سے کام لے کر کچھ کہتے ہیں تو نہایت لطیف  
 معلوم ہوتا ہے اور جب یہ ترکیبیں اضافاتِ مسلسل کے ساتھ آتی ہیں، تو جب مزے دار  
 چیز ہو جاتی ہیں۔ اردو میں یہ رنگ خاص غالبؒ کا ہے اور اگرچہ اس زمانے میں اس کے  
 مقابلہ کی پیدا ہو گئے ہیں، لیکن ان کی نظیر از منہ گزشتہ میں نہیں ملی۔ کہتے ہیں:

دیکھو تو دلِ فرسی اعادہ نقش پا سوچِ خرام یار بھی کیا گلِ کتر مگی  
 سرِ خُکِ سرِ حصرِ آواہ، نورِ آئینِ دامن ہے دل ہے دست و پا اُنگارہ پر خود وارِ بستر ہے  
 کون ہوتا ہے صبح سے مردِ لکھی عشق ہے کمر لب ساقی پہ صلا میرے بعد  
 دلِ حسرت زدہ تھا ماکہ لذتِ درد کام یاروں کا بقدر لب و دماغ نکلا  
 ہے تو آموزِ فنا ہرچہ دشوار پند سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آسان نکلا  
 نازِ ایامِ خاکسترِ نشینی کیا کہوں پہلوئے اندیشہ و تہمتِ بسترِ سہلاب تھا  
 عشرتِ عقل کہ اہلِ تنہا مت پرچہ صبو نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہوتا



عشرت پارہ دل رخم تھا کھانا  
لذتِ ریش بھر فرق تنگ داس ہوتا

نظر بندی کے مضامین سے، جو زیادہ تر قاری کے مشہور شاعر عبدالغفار بیگل  
کی تھکیہ کا نتیجہ ہیں۔ اگر قطع نظر کر کے دیکھے تو ان کے دیوان کے سطح پر ایسے اشعار سے  
بھرے پڑے ہیں جو طرفہ بیاں، اسلوب بندش، صفائی مضمون اور پاکیزگی خیال کا  
بہترین مرقع ہیں۔ اس قسم کے اشعار سے ان کی طبیعت کا اصلی رنگ معلوم ہوتا ہے اور  
آدم کی شان ظاہر ہوتی ہے:

ہم رنگ کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے      مرتے ہیں، ولے، ان کی تھا نہیں کرتے  
یہ بامع، لومیدی ارباب ہوں ہے      غالب کو برا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے  
دیا ہے دل اگر اس کو، بڑھ ہے، کیا کہیے      ہوا عجب تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے  
یہ خود کو آج نہ آوے اور آئے کن نہ رہے      تھا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے، کیا کہیے  
میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی      لکھ دیا بن جملہ اسباب ویرانی مجھے  
تسکین کو ہم نہ روکیں جو ذاتی نظر لے      حوٹن خلد میں جری صورت گر لے  
واسے، داس بھی خود محض نے نہ دم لینے دیا      لے کیا تھا کمر میں ذاتی تن آسانی مجھے  
تم کو بھی ہم دکھائیں کہ بھٹوں نے کیا کیا      فرصت کھا کھل فیم پنہاں سے گر لے  
سب کہاں، کچھ لالہ دگل میں لٹایاں ہو گئیں      خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

داس کیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب

یار تمہیں جتنی دعا کیں برفِ جہاں ہو گئیں

تصوف کا رنگ، جو مشرقی شاعری کا جزو اعظم ہے، غالب کے کلام میں بھی  
بہت چمکا ہے۔ مذہبی حیثیت سے چوں کہ وہ بہت وسیع نظر رکھتے تھے اور خود اپنے ہی  
دیوان کے اعتبار سے موجد بھی تھے اس لیے اس میدان میں بھی ان کا سب سے بڑا اثر ہوا  
نکل جاتا ہے:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

لو دیا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہے عجب طیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہر  
 ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں  
 رہا آباد عالم اہل ہفت کے نہ ہونے سے  
 بھرے ہیں جس قدر جام و سیر، نئے خانہ خانی ہے  
 عزم نہیں ہے ٹوٹی نوا ہائے راز کا  
 ہاں درد جو جواب ہے، پردہ ہے ساز کا  
 ہے پرے سرحد اوراک سے اپنا مہر  
 قبلے کو اہل نظر، قبلہ نما کہتے ہیں

مقامی زبان پر رجحان پیدا کرنے کے بعد سلاست پسندی کا ٹکڑہ بھی بڑھتا گیا۔  
 بعض بعض طزلیں ایسی صاف و شستہ زبان میں کہی گئی ہیں کہ باجہ و شاہ۔ اس سے  
 ثابت ہوتا ہے کہ اہل کمال ہر چیز کو اپنا بنا سکتے ہیں۔ اردو شعرا میں سادہ گوئی کی مثال  
 تھر کے کام سے زیادہ کہیں اور نہیں مل سکتی۔ لیکن ان کے بعد غالب کا فہر ہے اور  
 سلاست زبان و لفظی مطالب کے ساتھ اگر ان کی بازگشتیابی کو بھی شریک کر لیا جائے  
 تو تھر سے غالب کی دوسرے بڑے جاتے ہیں۔ دیکھیے، کس انداز سے فرماتے ہیں اور کلام  
 کے ربط و تسلسل میں سرسوفرق نہیں آتا۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال پار ہوتا  
 اگر اور چیتے رہتے، بھی انتظار ہوتا  
 کوئی بھرے دل سے پوچھتے تھے چرخ کش کو  
 یہ شش کہاں سے ہوتی، جو بکر کے پار ہوتا  
 یہ کہاں کی دوستی ہے کہ چنے ہیں دوست ناچ  
 کوئی چادر ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا  
 ہوئے مر کے ہم جو دوا، ہوئے کیوں نہ فرقی دیا  
 نہ کہی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں سوار ہوتا

یہ مسائل تصوف، یہ ہزار بیان غالب  
تھے ہم دلی سمجھتے تھے نہ بارہ خوار ہوتا

درد صفت کشی روا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا  
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو اک تماشاً ہوا، بگلا نہ ہوا  
ہے خبر گرم ان کے آنے کی آج ہی گھر میں بدلتا نہ ہوا  
ہاں دی، دی ہوئی اسی کی قسم حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا  
کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی  
سوت کا ایک دن صبح ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی  
آگے آتی قسمی حال دل پہ قسمی اب کسی بات پہ نہیں آتی  
ہاں ہوں خواب طاعت و زہد پہ طریقت اور نہیں آتی  
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں دہنہ کیا بات کر نہیں آتی

بعض غزلوں میں قطعہ بند کی صورت پیدا ہوگئی ہے اور وہ مجموعی حیثیت سے  
دل کٹی و دل فرجی میں بھائے خود حدیم الطیر ہیں۔ پاکیزگی خیالات اور طرز بیان کی  
طوبی نے مل کر عجیب کیفیت پیدا کردی ہے۔ اس قبیل کی غزلیں اردو میں رائج نہیں اور  
غالب کے دیوان بھریں دہنیں سے زیادہ نہیں۔ ایک غزل مسلسل ہے:

ہب کہ تھہ بن نہیں کوئی موجود بھر یہ ہنگامہ اسے خدا کیا ہے  
ہے پتی چہرہ لوگ کبھی سیں غزوہ و عشق و ادا کیا ہے  
ٹھکنی زلف غریب کیوں ہے تکرہ چشم سر سہا کیا ہے  
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں اور کیا چڑ ہے ہوا کیا ہے  
اسی طرح ایک دوسری غزل:

مذت ہوئی ہے یاد کو مہماں کیے ہوئے جوشِ قدح سے برم چراغاں کیے ہوئے  
کرتا ہوں جمع بھر بھر لطف لطف کو عرصہ ہوا ہے دولتِ مژگاں کیے ہوئے  
بھر پے سستی جڑ صبت دل کو چلا ہے عشق سلامتی صد ہزار تک داس کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوں      زلف سیاہ رخ پہ پرچیاں کیے ہوئے  
اک نوہار باز کو تاکے ہے پھر نگاہ      چہرہ فروخ سے سے گھٹاں کیے ہوئے  
جی دھڑکتا ہے پھر دہی فرصت کہ رات دی

پہنچے رہیں حضور ہاتاں کیے ہوئے

اس کو ضمن حقیقت کہو یا امر واقعی، کلام غالب کے مطالعے سے دماغ اور  
روح کو تقویت اور مسرت کا سامان بیم پہنچتا ہے اور اس کا گنج اعجاز کسی انتخاب سے  
نہیں ہو سکتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ غالب ایسا قادر الکلام اور دلچسپ بیاب شاعر، جو بحر نگاری  
میں بھی فرد ہو، ہندوستان میں آج تک پیدا نہیں ہوا، اور گو غالب کے پیش روؤں اور ہم  
عصروں میں بہت سے مشابہ، بعض بعض خصوصیات میں ان سے کسی طرح کم نہ تھے،  
لیکن تخلیق مجموعی ان کا کوئی مؤ مقابل آج تک نہ ہو سکا۔

ذوق مرحوم بھی اساتذہ اوروں میں جلیل القدر سمجھے جاتے ہیں اور وہ غالب کے  
ہم عصر بھی تھے۔ بہادر شاہ ظفر کا استاد ہونے کی حیثیت سے، بظاہر، ان کی عزت اور  
وقعہ غالب سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ ذوق کے ہندو کار اور نازک خیال شاعر ہونے میں  
شبہ نہیں، لیکن غالب کو وہ کسی طرح نہیں پہنچتے۔ انہوں نے جو سہرا غالب کے سرے کے  
جواب میں پہایاے بہادر شاہ، لکھا اپنی جگہ بہت اچھا ہے، لیکن انصاف پسند چیتیں اسے  
غالب کے سرے پر بھی ترجیح نہیں دے سکتیں۔ اسی طرح غالب اور ذوق کی اکثر فرقیں  
ہم طرح ہیں اور ان کے دیکھنے سے دونوں کا فرق دریافت ہو سکتا ہے۔ ذوق کا  
مطلب ہے:

بزار بلف ہیں جو ہر دم میں جاں کے لیے

ستم شریک ہوا کون آسماں کے لیے

شعر بہت اچھا ہے، لیکن اسی قافیے اور قریب قریب اسی مضمون کا شعر غالب  
نے نہایت نازک کہا ہے:

نوبہ امن ہے بیداد دست جاں کے لیے

دہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لیے

ذوق:

نہ دل رہا نہ نگہ، دونوں بل کے خاک ہوئے  
رہا ہے سینے میں کیا چشمِ غلوں فغاں کے لیے

غالب:

ہا سے گر مڑا یار تھوڑے غلوں ہے  
دکھوں کچھ اپنی بھی مڑگانِ غلوں فغاں کے لیے

غالب کے شعر میں ایک قسم کی جذبات ہے اور ذوق نے بالکل معمولی طور پر ایک پامال مضمون کو نظم کر دیا ہے۔ لکھنو کے استادوں میں آتش کا مرجعہ بہت بلند ہے اور صفائیِ کلام کے اعتبار سے وہ اپنے لکھنوی ہم عصر تاج سے بہت آگے ہیں، لیکن غالب کی بات ان میں بھی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ غالب چوں کہ کامیاب تھوڑے سے قطعی معطر تھے اس لیے ان کا ہر شعر جذبات کا پہلو لیے ہوتا ہے اور یہ صفت کسی دوسرے شاعر کے کلام میں موجود نہیں۔ آتش کہتے ہیں:

جب اشتیاق لکھا ہے غلوں خوار یار کو قاصد کا کشتہ آیا ہے خط کے جواب میں  
اگرچہ یار کی تعریف غلوں خوار زیادہ سوزوں نہیں تاہم شعر صاف ہے، لیکن غالب نے "جواب" کا کافی ترانہ باندھا ہے، لکھتے ہیں:

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ دکھوں میں جاتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں  
اس شعر کا مضمون سادہ ہونے کے باوجود کس قدر دلچسپ ہے، محبوب کی مزاح شاعری کی تشیل اس سے زیادہ دل چسپ نہیں ہو سکتی۔ اس زمین میں غالب نے دو غزل کہا ہے اور بعض قافیے تو نہایت محبت کے ساتھ نظم کیے ہیں، دیکھیے:

مجھ تک کہ ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام  
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں  
میں اور جڑ و سبب، خدا ساز بات ہے  
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہیں آج کیوں دلیل کہ کل تک نہ تھی پُند

گستاخی فرشتہ طاری بناب میں

عالم کے دیوان میں ایسے اشعار معقول تعداد میں نکل سکتے ہیں جو بلاغت

اور وسعت معنی کے اعتبار سے عدیم الطیر ہیں۔ انصاف پسند صاحب نے قلمی کشمیری کا یہ شعر:

ہنر بچے خطیہ ہنر مرا کرد اسیر دام ہر رنگ زمین بود گرفتار شدیم  
من کر اپنا سارا کلام اس کے عوض میں دے دینا منظور کیا تھا۔ اسی طرح حقیقت میں شعرا  
کے لیے اپنے دیوان کے دیوان عالم کے ایک ایک شعر پر غار کر دینا بعید از قیاس نہیں  
ہو سکتا۔ دو چار شعر ہم یہاں اس قبیل کے لکھتے ہیں جن سے معصفت کے ذہن کی بلندی  
اور طبیعت کا معنوی عمق معلوم ہو جائے گا:

دقادی بھڑپ استواری اصل ایساں ہے

مُڑے بت خانے میں تو کہے میں گاؤں پرہمن کو

میں نے کہا کہ بام باز چاہے غیر سے تھی

من کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

سنھلنے دے مجھے اے ناامیدی، کیا قیامت ہے

کہ دامن خیالی بار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

مری قہیر میں مضر ہے اک صورت ظاہری کی

جیوتی برقی غریب کا ہے خون گرم دھواں کا

گھر ہمارا جو نہ بدلتے بھی تو دیوان ہوتا

بکر کر بکر نہ ہوتا تو بھابھاں ہوتا

کوئی دیہاتی سی دیہاتی ہے

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ہے پرے سرحد اوراک سے اپنا سکھو

قبلہ کو اہل نظر قبلہ نہ کہتے ہیں  
 قلنس میں مجھ سے رونا چاہی کہتے نہ دارِ اہم  
 مری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیانہ کیوں ہو  
 غفلت کدے میں میرے ہبِ فم کا جوش ہے  
 اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو فوٹس ہے  
 دیکھے پاتے ہیں علق جوں سے کیا فیض ہے  
 اک برص نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے  
 ہارچہ اطفال ہے دنیا برے آگے  
 ہوتا ہے شب و روز تماشا برے آگے  
 اک کھیل ہے اور تک سلیماں برے نزدیک  
 اک بات ہے اٹار سمیٹا برے آگے  
 جو نام نہیں صورتِ عالم مجھے حکور  
 جو دم نہیں ہستی اشیا برے آگے  
 مت بچو کہ کیا حال ہے میرا جڑے پیچھے  
 ٹو دیکھ کہ کیا رنگ ہے میرا برے آگے  
 شاد و غم ملائیں غالب کے کلام میں ایسی مل سکتی ہیں جو لائقِ سلیم کے  
 خلاف ہو سکتی ہیں، مثلاً:

فلکس میں گزرتے ہیں جو کوپے سے وہ میرے  
 کندھا بھی کہاؤں کو بدلتے نہیں دیتے  
 دھول دھچا اس سراپا باز کا شہدہ نہیں  
 ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب ٹیٹن دہلی ایک دن  
 غالب کا اردو کلام بہت کم ہے اور جو کچھ انھوں نے کہا تھا اور نظری شعرا  
 خارج کر، سننے کے بعد جو کلام رہا، اس میں بھی عجیب تفرقہ پڑا ہے۔ اب بھی اکثر ان کا

غیر مطبوعہ کلام کہیں کہیں مل جاتا ہے۔ ہندوستان کے بعض مقامات کے قدیمی کتب خانوں میں دیوان غالب کے ایسے نسخے موجود ہیں، جن میں سے اکثر خود مصنف کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ مرقعہ دیوان سے جب ان کا مقابلہ کیا جاتا ہے، تو اول الذکر میں کام کا ایک حصہ بالکل موجود نہیں۔ مرصع ہوا رسالہ "متخزن" <sup>۳۲</sup> میں ایک نظم "ظاہر دل" کے عنوان سے نقلی قسمی جو حسب ذیل ہے:

اٹھا اک دن گولا سا جو کچھ میں جوشِ وحشت میں  
بھرا آسمان سر گھبرا گیا تھا دل بٹھاں سے  
نظر آیا مجھے اک ظاہر بھروسہ بڑبڑ  
پھٹتا تھا سر خوردہ دیوار گشتاں سے  
کہا میں نے کہ او ناکام! آخر ماہرا کیا ہے  
پڑا ہے کام تھ کو کس ستم گر آئندہ جاں سے  
جسا کچھ کھل کھلا کر پھیلے پھر مجھ کو جو بچانا  
تو میں دیا کہ جو بے طوں بھی پلوں کے دامن سے  
کہا، میں سید ہوں اس کا کہ جس کے دام گیسو میں  
چننا کرتے ہیں طائر روز آکر باغِ رضواں سے  
اسی کے زلف و رخ کا وصال ہے شام و صبح کو  
نہ مطلب کفر سے ہے اور نہ ہے کچھ کام ایساں سے  
چشمِ غور جب دیکھا، سرا ہی ظاہر دل تھا  
کہ جل کر ہو گیا ہوں خاک اپنی آہ سوزاں سے

مگر سید حسن بکراہی کو یہ قطعہ ان کے والد بزرگوار سے پہنچا ہے اور مؤخر الذکر کے بیان کے مطابق اس کے مصنف غالب دہلوی ہیں۔ مگر صاحبِ اور ان کے والد ماجد کے بیان کی تردید ہمیں منظور نہیں، لیکن غالب کا قدرتی رنگ اس میں مطلق نظر نہیں آتا اور اس لحاظ سے ہمیں اس کے غالب کی تصنیف ہونے میں ضرور



کلام ہے۔

شیخ عبدالقادر صاحب بی اے کو عالم کی اور بھی کچھ غیر مطلوبہ غزلیں دستیاب ہو چکی ہیں۔ اسی طرح اگر کوشش کی جائے، تو شاید کچھ اور کلام بھی فراہم ہو سکے اور اس کے بعد عالم کا دیوان مکمل طور پر شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ سکتا ہے۔

غزلوں کے علاوہ قصائد اردو بھی عالم کی یادگار ہیں۔ لیکن ان پر مہذب کی ضرورت نہیں۔ ان کے قاری قصائد بے شک غزلیں کے قصیدوں سے کسی طرح کم نہیں کہے جاسکتے، لیکن اردو میں ان کے قصیدے ایسے نہیں جو سونا اور ذوق کے مقابلے میں لائے جاسکیں۔ تاہم اس کا انصاف اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس صنف میں انھوں نے جو کچھ کہا، اپنے رنگ میں بے مثل کہا ہے اور بعض مقامات پر تو اپنی سرگونی کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔ ان کا ایک قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے:

ہاں اے نہ تو نہیں ہم اس کا نام جس کو ٹوٹ جھک کے کر رہا ہے سلام  
اس قصیدے نے مولوی علی حیدر صاحب علیا لدھی ایسے غلامی سے بھی، جنھوں نے "شرح دیوانی لقا" میں نہایت بے باکی سے ان کے محبوب شاعری کو ظاہر کرنے میں جھل نہیں کیا، اس کا اقرار کر لیا ہے کہ مکی کی جڑ تھ اور مضامین کی تازگی کے اعتبار سے بے مثل چیز ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ عالم جو کچھ کہتے تھے، سب سے جدا کہتے تھے اور اس احترام کو انھوں نے اپنے مدید قصائد میں بھی بہت خوبی سے ملحوظ رکھا ہے۔ دیکھیے، ممدوح کی توصیف کا پہلا کتا چار اور خیالات تازہ ہیں:

قلب چشم و دل بہادر شہ	مظہر ذوالجلال والاکرام
شہسوار طرحہ انصاف	نوبہار جدوجہ اسلام
چشم و زور خروارہ شکوہ	روح اللہ عارفانہ کلام
دار و بک جانتے ہیں تجھے	ایرج و نور و خرو و بہرام
زور بازہ میں مانتے ہیں تجھے	کیو و گوند و بیون و دہرام

مرزا: سوچا کئی نادر

اندر آجانی صسام

ایک دوسرے قہیدے میں بھی مدحہ مضامین کے نظم کرنے میں قوت مغلّیہ کی حدیں کھینچ دی ہیں:

مر کا نپا چرخ چکر کھا گیا بادشہ کا راجہ فکر کھلا

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب اب طوے پائے حبر کھلا

تلاش کا ہوا ہے روشناس اب عیار آبروے زر کھلا

شہ کے آگے دھوا ہے آئندہ اب آل سہی اسکندر کھلا

ملک کے حادث کو دیکھا خلق نے

اب فریب طرل و سحر کھلا

غزلیات و قصائد کے علاوہ بہت سے قطعات و رباعیات وچ اپنی ریختہ کا ایک

جزو ہیں اور ان کے دیکھنے سے عالم کی طبائی اور بذراستی کا جو دل سے مقرر ہوتا پڑتا ہے۔

نزل گوئی کی ایک جدید روش نکالنے کا سہرا عالم کے سر ہے اور اسی کے ساتھ نثر اردو بھی ان کے احسان سے سبک دوش نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ نئی طرز کے صاف و سادہ خطوط کی ابتدا اردو میں عالم سے ہوئی ہے اور انھیں کی تخلیق کے مصدق میں آج اردو نثر اس قدر صاف اور سلیبی ہوئی نظر آتی ہے۔ علم برداشتہ اور دماغ انکسار پر بازی کا لطف اگر اٹھاتا ہے تو ان کے رقعات کے دو مجموعوں "معمود ہندی" اور "معمودے سنی" کا مطالعہ کرو۔ اس سے نہ صرف تمہیں ان کے علم کا دور معلوم ہوگا، بلکہ ان کی زندگی کی تصویر بھی ہو بہو نظر آئے گی۔ ہم اس جگہ ایک خط کا انتخاب دینے ناظرین کرتے ہیں۔ اس سے مجموعی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مرزا قربان علی بیگ ساکن کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں۔ مخلوق کا کیا ذکر، بلکہ بن نہیں

آئی۔ اپنا آپ کشائی بن گیا ہوں۔ رنج و دل سے خوش ہوں ہوں، یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر محسوس کیا ہے، جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں، لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اترتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے، اب قرض داروں کو جواب دے۔ کچ تو ہیں ہے کہ غالب کیا مراد بڑا طحہ مراد بڑا کافر مراد ہم نے ازراہ تقسیم، جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے بخت آرام گاہ و عرش انیس ظباب دیے ہیں، بنوں کہ یہ اپنے کو شاو کلم روغن جانا تھا۔ سحر مقرر اور ہادیہ زادیہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئیے نظم الدولہ بہادر، ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوک ساربا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ لکھی، حضرت نواب صاحب نواب صاحب کیسے؟ اور قلان صاحب آپ سلوٹی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا ہے حقیقی ہو رہی ہے۔ کچھ تو آکسو، کچھ ہولو۔ بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندمی سے گلاب، بڑا ز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، مزاج سے دام قرض لیے جاتا ہے۔ یہ بھی سوچنا ہوتا، کہاں سے دوں گا۔

عالم اسی طرح اور غلطو میں بھی اپنے عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں سے حرا لے کر باتیں کرتے ہیں کہ سنے والوں کو بھی حرا آجاتا ہے۔

عالم نے اردو نظم و نثر پر جو احسانات کیے ہیں ان سے اہل یورپ کو روشناس کرانے کی اشد ضرورت تھی۔ خصوصاً اس زمانے میں جب کہ وہاں مشرقی علوم کے ساتھ خصوصیت سے اشتنا ظاہر کیا جا رہا ہے۔ ہمیں مسٹر صلاح الدین عدا بخل ایم ایس بی سی ایل کامنوں ہونا چاہیے کہ انھوں نے انگریزی میں ایک کتاب غالب کے حلق شائع کر کے ایک بڑی علمی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب ولایت میں بھی

اور اس میں غالب کی اردو فارسی شاعری پر جسوڑ بحث کے علاوہ ان کے سوانح کا ذکر بھی نہایت دلچسپی کی چیز ہے۔

غالب کی شاعری کی کیفیت اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی۔ چاہتے کہ ان کے فارسی کلام کی مصلحت و نشان کے پیرے سے پردہ نہ ہٹایا جائے۔ اس کے علاوہ ان کے شعر نکلنے کی دلچسپ کیفیت، برہان و ”قاطع نہ بان“ کے قصبے کی طوالت، اور ان تمام علمی خاکروں اور مباحثوں کے انہوں تک تازگی پر بھی بحث کرنا ضروری تھا۔ لیکن یہ تمام باتیں ہمارے دائرہ اختیار سے باہر ہیں اور اس لیے ہمیں ان امور پر قلم اٹھانے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

☆

نوٹ۔ مضمون کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ”آئینہ“ کی پہلی قسط کے سطور ۲ اور ۵ کے درمیان ڈاکٹر آرٹ دھو پر شاکر بیگم نے مرزا غالب کی وہ آخری تصویر شائع کی جو کسی پر لگی ہوئی تھی۔ تصویر میں غالب بہت ضعیف نظر آ رہے ہیں۔ شاکر کو یہ افکار حاصل تھے کہ انہوں نے ”آئینہ“ ان آباد اور ”المعصر“ مضمون میں مرزا غالب کی وہ دور تصویر اور کسی خوب شائع کیے۔ (ڈاکٹر بیگم)

## حواشی

- ۱۔ ”آئینہ“ مئی ۱۹۳۳ء (ص ۱۱ تا ۱۲) میں مولوی محمد ابراہیم نے اسے کا مضمون ”غالب غالب“ چھپا تھا۔  
 ۲۔ دیگر دو حواشی ہیں جن میں مولوی کا مضمون شاکر کو لے دیا گیا ہے۔  
 ۳۔ غالب کی یہ قول ”مضمون“ جلد ۱۱ فیروز آباد پبلیکیشنز، لاہور (ص ۶۰) میں دہلی کی تصدیق کے ساتھ لکھی گئی۔

تصویر سے دیکھتے ہیں کہ مولوی شاکر نے مولوی ابراہیم کا جس میں انہوں نے

نائب کا ایک قصہ سنا۔ قہقہے کے سہہ ہوئے میں کیا لکھ ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی  
 اس کے چاکن سے یہ قصہ اس کے والد صاحب سے اس کو پہنچا اور اب تک نائب  
 کے کسی کام میں شائع نہیں ہوا۔  
 ڈاکٹر مجذبی اس غزل کو نائب کی تصنیف ہونے سے انکار کرتے تھے، تاہم اس غزل کا کس جو  
 سماجی کام نائب ”میں شائع ہوا تھا۔



## غالب اور رسالہ ”معارف“

”معارف“ اردو کا بہت پرانا طبعی اور ادبی ماہ وار رسالہ ہے۔ جو رمضان ۱۳۳۳ھ (جولائی ۱۹۱۶ء) میں اعظم گڑھ سے چھپنا شروع ہوا اور اب تک برابر چھپتی رہی ہے۔ اس کے پہلے ایڈیٹر مشہور عالم دین سید سلیمان ندوی (۱۹۵۳ء) تھے۔ پرانے لکھنے والوں میں ایڈیٹر صاحب کے علاوہ ڈاکٹر اقبال، اکبر الہ آبادی، جواں ملیح آبادی، مولوی عبدالسلام ندوی، عزیز کھٹوی، سجاد انصاری، شوکت سہروردی، مولوی عبدالرزاق، اختر کھٹوی اور عبدالجبار دریادہ کی نامی ذکر ہیں۔

اس وقت پھرے سائے ”معارف“ جلد ۹، نمبر ۴، بابت ماہ شعبان ۱۳۴۰ھ (اپریل ۱۹۲۲ء) کا شمار ہے۔ اس میں کتب خات نام پور کے عالم حافظ احمد علی خاں رام پوری کا ایک مفید اور نادر مضمون ”سراج الدین ظفر شاہ دہلی اور مرزا غالب کی زندگی کا ایک گم شدہ ورق“ کے عنوان سے موجود ہے۔ اس کی دوسری قسط ”معارف“ جلد ۵، نمبر ۵، (۶۷-۳۵۹) بابت مئی ۱۹۱۶ء میں چھپی تھی۔ انہی مضمون کے حلقہ مولوی الطاف حسین حالی نے بھی ”یادگار غالب“ میں تھوڑا سا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے غالب کی شہرہ کا نام قطعی سے ”شیخ الباطل“ لکھا جب کہ اصل میں یہ مثنوی مولوی

امام بخش سہانی کی تصنیف ہے۔ غالب کی شہسوی کا کوئی نام نہیں ہے۔ اس کی وضاحت پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم نے اپنے مضمون "مرزا غالب کی ایک ہنگامہ نثر شہسوی" مضمون "نثر رشادۃ ادیب" (ص ۲۰۳-۱۹۴) مطبوعہ ۱۹۶۹ء میں فرمائی ہے۔ حالی "یادگار غالب" میں بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی بیماری اور صحت یابی کے بارے میں درگاہ حضرت مہمان لکھنؤ میں بادشاہ کی طرف سے علم چن حانے کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

ایک دفعہ بہادر شاہ بہت سخت بیمار ہوئے۔ اس زمانے میں مرزا حیدر شکوہ، جو اکبر شاہ کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے، وہ بھی لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے ہاں مہمان تھے۔ ان کا ادب انکا مشہوری تھا۔ جب بادشاہ کو کسی طرح آرام نہ ہوا، مرزا حیدر شکوہ کی صلاح سے خاک شفا دی گئی اور اس کے بعد بادشاہ کو صحت ہو گئی۔ مرزا حیدر شکوہ نے غدر بانی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہو جائے گی تو حضرت مہمان کی درگاہ میں، جو کہ لکھنؤ میں ہے، علم چن حادس گا۔ چنانچہ انھوں نے لکھنؤ جا کر بادشاہ کو عرضداشت بھیجی کہ میرا مقدر غدر ادا کرنے کا نہیں ہے، حضور مدد فرمائیں۔ یہاں سے بادشاہ نے کچھ بدچہر مرزا حیدر شکوہ کو بھگایا اور انھوں نے بڑی دھوم دھام سے علم چن حادیا، جس میں اورج کا تمام شاعری خاندان اور امراء و ملا سب شریک تھے اور بھتیجہ ناصر کے ہاتھ سے علم چن حادیا گیا۔ اس واقعے کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہو گئی کہ بادشاہ شہید ہو گئے۔ اس شہرت کا بادشاہ کو بہت رنج ہوا اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے اس کے تدارک کے لیے کچھ رسالے شائع کرائے اور بہت سے دشمنیات کو چوں اور ہزاروں میں چپاں کرائے گئے اور بادشاہ کے علم سے مرزا صاحب نے بھی ایک شہسوی قادی زبان میں لکھی

جس کا نام خانہ "دعویٰ باطل" رکھا گیا تھا اور جس میں بادشاہ کو تصفیٰ کے اہتمام سے بری کیا گیا تھا۔ اس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی بلکہ جو مضامین حکیم احسن خان نے بتائے تھے ان کو قاری میں نظم کر دیا تھا۔

جب یہ مثنوی لکھو پہنچی تو بہتہ انصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ آپ نے خود غصہ شیعہ اور مرزا حیدر قزوینی کی نسبت اس مثنوی میں کیا اور ایسا لکھا ہے؟ مرزا نے لکھ بھیجا کہ میں لازم شاہی ہوں جو کچھ بادشاہ کا نظم ہوتا ہے، اس کی تعمیل کرتا ہوں۔ اس مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن خان کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائے جائیں۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ جب بادشاہ بہادر شاہ ظفر بھاری سے شغاباب ہوئے اور انہوں نے دہگاہ حضرت عباس لکھنؤ میں نظم چڑھانے کے لیے مرزا حیدر قزوینی کو بلایا تھا، تو ۱۶ ربیع الاول ۱۲۷۰ھ (مطابق دسمبر ۱۸۵۳ء) کو سلطان احمد علی شاہ سید محمد بہتہ انصر نے شاہانہ مجلس کے ساتھ دہگاہ میں نظم چڑھایا اور بادشاہ کا تو تعریف کر دیا مگر یہ خبر دہلی پہنچی تو لوگوں نے بادشاہ کے خلاف اپنا رد عمل ظاہر کیا۔ رفتہ رفتہ نظم کے لکھنے نے طویل پکڑا اور اس واقعے کی حمایت اور مخالفت میں جو کچھ بھی لکھا گیا وہ حیدر قزوینی نے ایک رسالے میں جمع کیا اور یہ رسالہ ۱۲۷۰ھ ہجری (مطابق ۱۸۵۳ء) میں "رسالہ نظم حیدری" کے عنوان پر شائع ہوا۔ اس کا ایک نسخہ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے نام اور الوجود کتب خانے میں موجود ہے۔ "خاتب کی" "مثنوی مرزا نوٹہ خاتب" کے جواب میں لکھنؤ میں ایک مثنوی مرزا حیدر قزوینی نے اپنے نام کی حمایت سے "شہادت حیدری" کے نام سے لکھی جس کا ایک مطبوعہ نسخہ ۱۲۷۰ھ ہجری (۱۸۵۳ء) کا پروفیسر مسعود حسن رضوی "خاتب" کے نام اور الوجود کتب خانے میں موجود ہے۔ "خاتب کی" مثنوی کے جواب میں میر دوست علی علی شاہ



آئین نے بھی ایک مثنوی بعنوان "مثنوی حیدر علی در مدح مثنوی جلی دہلی" لکھی۔ اس میں عالم کے اشعار اور ان کے جواب "قولہ اور جواب" کے عنوان سے درج کیے گئے ہیں۔ یہ مثنوی ۱۲۷۰ھ میں شائع ہوئی تھی۔ ظیل کی مثنوی کے جواب میں شیخ دام بخش صہبائی نے "دعہ ابہائل" کے نام سے مثنوی لکھی جو ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۳ء) میں افضل المطالع دہلی میں چھپی تھی۔ اس میں مفتی محمد عباس کی بھی ذکر کیا:

چند من بشنو و بماند مکمل      بگذر از صحت سیاہ شرح  
ایں سیاست چاہ خواہد کرد      دل چہ دولت سیاہ خواہد کرد

مفتی صاحب اس زمانے میں نکلنے میں تھے۔ جب انھوں نے "دعہ ابہائل" دیکھی تو اس کے جواب میں مثنوی "خطاب فاضل" لکھی۔ یہ ۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹ء) میں شائع کی گئی اور ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) میں اختتام پذیر ہوئی۔ مثنوی مطبوع مجمع البحرین لودھیانہ میں ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں چھپی تھی۔

کتب خانہ رام پور میں تاریخ قاری میں ایک خطوط زیر نمبر ۲۲۹ "دستور العمل لودھی" کے نام سے محفوظ ہے۔ حافظ احمد علی خاں (جامع کتب خانہ) نے آج سے کوئی ۸۰ سال پہلے اس کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔ "معارف" کا یہ شمار نہایت کم باب ہے اور اس کا ایک نسخہ کتب خانہ فیضی نعمانی لکھنؤ میں موجود ہے۔ چوں کہ یہ مضمون بادشاہ دہلی اور مرزا عالم کے بارے میں ایک کم شدہ واقعے سے متعلق ہے، اس لیے ذیل میں پورا درج کیا جاتا ہے:

اس کتاب میں سلطان احمد سوم کا سید محمد صاحب مجتہد لکھنوی کے عرض اور شاہی احکام، چند قوے اور مختلف خطوط نقل ہیں۔ ان خطوط کی سطروں میں سراج الدین ظفر شاہ اور مرزا عالم کی زندگی کے ایک خاص واقعے پر روشنی پڑتی ہے۔ دہلی کے انخطاط اور لکھنؤ کے عروج کے زمانے کا ایک خاص واقعہ یہ ہے کہ جامعہ تھوری کے چند افرادوں نے لکھنؤ آکر شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ ان میں سے بعض شیعوں نے لکھنؤ آکر یہ مشہور کیا کہ بادشاہ بھی شیعہ ہو گئے ہیں اور بادشاہ کی طرف سے نہری

شق بھی انھوں نے پیش کیا۔ دہلی کے اکابر و ایمان اور عام مسلمانوں کو جب یہ معلوم ہوا تو وہاں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مقرر شاہ نے حکام وگریزی کے درمیان سے اس کی حلانہ تردید کی اور غالب سے ایک فاری مشوی کھوائی، جس میں اس کی تردید تھی۔ لکھنؤ کے اعلیٰ دربار کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس مشوی کا مصنف اہم ہند کا معزول بادشاہ مقرر نہیں بلکہ کشور خن کا حکم دان مطلق غالب ہے۔ اس کے بعد غالب نے اپنا ایک قصیدہ لکھ کر دربار لکھنؤ میں بھیجا۔ یہ گویا اس مشوی کی حلانی ہے۔

یہ تمام واقعات مولانا سید محمد صاحب مجتہد کی وساطت سے ہوئے تھے۔ اس لیے اس مجموعے میں یہ دلچسپ مراسلات موجود ہیں اور آج ہمارے لیے ان ہندوگوں کی زندگی کے کم شدہ اوراق ہیں۔ ۱۲۷۰ھ میں شاہ ایظقر نے سلطان اعلیٰ سید محمد صاحب کو یہ قریرہ برکا کر بھیجی:

افضل اعلیٰ افق البقیاء، سیدالمراد، مشقائے مومنین و مومنات

مجتہد البصر و انراں سلطان اعلیٰ دامت برکاتہ۔

بھلاؤ دارے کہ محبت و دلاے اعلیٰ بیت طہیم اسلام دل اختیار کردم۔ و از کل اعدائے علی ابن ابی طالب علیہ السلام قلعی تھرا صوم و تحمیر نام بازہ شروع کردی۔ بعد افاضل ہائیں تعویذ جناب سیدالشہداء علیہ السلام و اعلیٰ نسب ترائیں خواہ پنے برکت۔ از سنی حق و اقامت من اللہ طہصل مدارج دنیہ کہ بران راجع ام، یہ زبان پر غروردار کامکار و لاجار، سعادت الطوار مرزا محمد حیدر شکرہ بھاد، کہ درین خصوص رازدار است، دریافت خواہد گشت، زیادہ برکات۔

ترجمہ: اللہ کا شکر ہے کہ محبت اعلیٰ بیت طہیم اسلام دل سے میں نے اختیار کی ہے اور حضرت علی علیہ السلام کے دشمنوں سے قلعی تھرا کیا ہے۔ امام ہارے کی قہیر شروع ہو گئی ہے۔ سعادت تمام ہو جانے کے بعد جناب سیدالشہداء کی ہائیں تعویذ ہوا

کریں گی۔ میری کوشش ہے، احکامِ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے۔ مفصل خارجِ دین کے، جن پر میں راسخ ہوں، مرزا محمد حیدر شکوہ کی زبانی معلوم ہوں گے۔ وہ اس معاملے میں رازدار ہیں۔“

بادشاہ نے ایک شکوہ نمبری خاص مرزا حیدر شکوہ کو اور ایک مرزا نور الدین بہادر کو بھی لکھا۔ یہ دونوں شیخوڑے مرزا سلیمان شکوہ کے پوتے ہیں۔ دہلی سے علم اور مرثیہ تصنیف ابو ظفر مرزا حیدر شکوہ لے کر گئے تھے۔

نقلِ فقہ نظام حیدر شکوہ: ”نور چشم راحت جان مرزا حیدر شکوہ بہادر موردِ تفتشاتِ بودہ۔ بداند کہ ہر دو علم صرف از اعتقاد و قلابانِ ظلام بناب حضرت مہاشن عکد ارجمیدہ گزرائیدہ ام۔ صرف برائے آسودگیِ دین۔ کے فی واقعہ کہ حمایت پر چہ قدر برائے امی احقر شہدہ چند بار زیارت شدہ، قاطبِ اعجاز نیست۔ از بدوقت ملاقات باطور بیان خواہم فرمود۔ ہر دفعے کہ از اہل بیت، حسد کی داشت بر دشمن عام ہاں پیش ہاں، ایمن است ایمان۔“

ترجمہ: دونوں علم برائے اعتقادِ خدای حضرت مہاشن عکد از غدار کہے ہیں، محض دین کی پیروی کے واسطے۔ کسی کو کیا معلوم کہ کسی قدر حمایت اس احقر پر ہوئی۔ چند بار زیارت ہوئی۔ قاطبِ اعجاز نہیں ہے۔ ملاقات کے وقت میں بیان کروں گا۔ جو شخص اہل بیت سے حسد رکھتا ہے، اس پر جہنم لعنت ہو، پیش ہاں، یہی ایمان ہے۔

نقلِ فقہ نظام مرزا نور الدین:

”نور چشم والا قدر مرزا نور الدین بہادر، موردِ تفتشاتِ بودہ۔

بداند کہ دو علم در درگاؤ حضرت مہاشن گزرائیدہ حاضر شونہ۔ معلوم نیست کہ آپ فرزندِ علم گزرائیدہ یا نہ یہ طبعِ دنیا نہ گزرائیدہ ام۔ خدا داند کہ چہ طور حاضر فرمودہ علم فرستادہ ام۔

ترجمہ: علم جلد درگاؤ حضرت مہاشن میں چڑھا کر حاضر ہو، معلوم نہیں کہ تم نے علم چڑھایا یا نہیں۔ طبعِ دنیا کے لیے یہ علم پیش نہیں کیا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میں

نے کیا دیکھ کر علم سمجھا ہے۔

سلطان اعلیٰ نے شاہی شیعے کے وصول ہونے کے بعد مصاحب الدولہ بہادر کو رخصت کیا کہ میرے نام کے شاہی شیعے کو حضور بادشاہ اودھ میں پیش کر کے علم کے لیے جلیں کا انتظام کیا۔ چنانچہ امام باڑے میں جلیں کے ساتھ علم کیا اور فخر (بہادر شاہ بادشاہ) کا تعینف کردہ مرثیہ بھی پڑھا گیا۔ دہلی میں اس کا بڑا جہاں ہوا۔ فخر بھی گھبراے۔ صاحب ایجنٹ دہلی کی معرفت اس واقعے کی تفصیلات شروع کر دی۔ صاحب ایجنٹ شاہ جہاں آباد امین الدولہ من فرخز بہادر، دلیر جنگ کو یہ شیعہ صدرہ ۲۶ دسمبر ۱۸۵۳ء لکھا۔

دہلی امام یہ ملاحظہ تفصیلات سوالات علماء و مشائخ اہل شہر پر مضمون پیوستہ کہ از روئے اخبار و خطوط لکھو۔ دریاچہ اہل مردم رسیدہ کہ تھریچ ششم رابع الاول (۱۲۷۰ھ) سو حال مرزا حیدر گلو بہادر و مرزا نور الدین حیدر بہادر شیشی مذہب تھریکان مرزا سلیمان گلو بہادر و لکھو گئے۔ کمال جمل پ ہر اہل علما آں شہر برداشتہ بدنگاہ حضرت مہاش برودہ و فضیلت پناہ سیادت و سنگاہ سید محمد مجتہد مذہب شیعہ بدسب خود علم مذکور را در درگاہ موصوف نصب نمود و مرزا لیاں بطور ابلاغ آں علم بہ بدنگان والا کردہ و نیز مرزا نور الدین بر خیر برآمدہ مرثیہ بہ زبان آورد کہ حقمن... در مجمع کثیر بہ آواز بلند بر خواندہ و در مطلع آں مرثیہ تخلص حضور پر نور درج کردہ و قطعہ شیعہ نمبری خاص مقرر ترک کردی مذہب اہل سنت و جماعت و اختیار نمودی مذہب اہل تہذیب و دینی ارادہ تمجید امام باڑہ و اختیار تعویذ داری برودام موسومہ بجمہود مذکور ساختہ بدنگان والا را اختیار مذہب ردائش مسلم و بدنام ساختہ۔ چنانچہ اہل ہند لفظ و سہ اصل و محض افترا و بہتان است، زیرا کہ یہ مختلفہ الہی در عقیدہ راستہ حضور کہ بطریق اہل سنت و جماعت است ہرگز فخر و فساد راہ یافتہ و کلام مرثیہ... بر زبان الہام بیان نہ رفتہ و حق خاص بہ اشعار اختیار امور خلاف شرع نام بجمہود مذکور ہرگز دخلی تھلک کو ہر ملک نہ گودید۔ اہل ہند تھذیب و حدود آری مرزا لیاں مذکور است کہ بحضور پر نور منسوب کردہ اند۔ لیکن بیاد

آیہ کہ ایشان ہنگام حضورِ خود دریں جا ایں معنی بطریق حکایت و تذکرہ معروض داشت بودند کہ موافق قریب خود برائے حصول صحبت بندگان والا قرار دادہ ایم کہ بروقت غسل صحبت حضور از طرف خود کئے عیار ساختہ در شکر یہ بہ صحبت حضرت اقدس بزرگوار حضرت مہمان خواہیم داشت و سوائے ازیں کچھ مذکور نہ کردہ بودند و نیز اکثر شتہ ہانت در مقام رہا ذاتی خود ہا سبھل بہ مورخاں کتابیدہ بودی لیکن تمام فضیلت پناہ مذکور کلام تحریر بہ کہ مورخاں مرتبہ باشند برگز وقوع نماید۔ شاید مرزا ابان سطور بتایہ کلام مصلحت و منفعت خود ایں افزا پر حضور کردہ باشند و تحریر ہے اصل و باطل مرعوب کردہ وارد باشند و بھیدہ مذکور بر حقیقتاے نیک نہادی خود آں راہ در پایہ صدق داشتہ شہرت دادہ باشند۔ دریں صورت ملاحظہ آں شد کہ نزد آں سیادت دھنگہ رسانیدہ اند ضرورت قرار ہا معلوم شود کہ مطروقیں حوسہ و نگارندہ اسی کہست و بھو در واقع ایں حال تدارک اندازہ رختہ ایں قضاہ بطور مناسب لعل آید کہ بار دیگر کسے را جرأت ایں افزا پر داریا نہ گردد۔ لہذا نسب ارقام می باید کہ آں ادارت و دیانت مرتبت بہ حقیقتاے دولت خواہی و خیر اندیشی جمیع رتبہ ایں اہتمام و بدنامی بندگان اقدس نیز انگریزی خود تمام ایکٹ بہادہ لکھو ہے۔ مزید تاکید بر نگاہ کہ شوق مصلیٰ فہری خاص از بھیدہ مذکور بہر نوع کہ قواعد عقیدہ زود تر ارسال دادہ۔ ہر آئینہ عہدہ ایں معنی موجب استرخاے خاطر خاطر خواہد شد و تحولات شامد۔

ترجمہ: ان ایام میں سوالات طار اور مشایخ شہر پڑا کے ملاحظے سے معلوم ہوا کہ از روئے اخبار و خطوط لکھو یہاں دلوں کو اطلاع ہوئی ہے کہ چھٹی ربیع الاول (1240ھ) سنہ حال کو مرزا حیدر شکوہ بہادر و مرزا نور الدین حیدر بہادر قبیلی مذہب مرزا سلیمان شکوہ بہادر کے پوتوں نے ایک علم کمالی قبل سے عاصم بن شہر کے بلوں کے ساتھ حضرت مہاش کی درگاہ پر چڑھایا اور سید محمد بھیدہ انصر نے اپنے ہاتھ سے علم نصب کیا۔ دلوں مرزاؤں نے اس علم کا بھیجنا بادشاہ کا بیان کیا اور مرزا نور الدین نے خیر پر فائدہ کہ ایک اردو کا مرثیہ... چڑھا اور مرثیے کے حلق میں حضور (ہادشاہ) کا شخص

دروغ کیا تھا اور ایک قطعہ شہ مہری خاص موسومہ مجہد مذکور بنایا، جس میں ترک مذہب اہل سنت و الجماعت اور مذہب شیعہ کا اختیار کرنا اور امام باڑے کی تعمیر اور ہمیشہ کو حقیر دہری اختیار کرنا لکھا تھا۔ ہنگام دلا کو رابطی مذہب قبول کرنے سے بدنام اور مذہم کیا۔ یہ سب غلط و بے اصل اور افتراء و بہتان ہے۔ اس لیے کہ مصلحت الہی سے حضور کے عقیدہ رابطہ طریق اہل سنت و جماعت میں ہرگز لغو و لٹا کو دخل نہیں ہے اور کوئی مرتد... تعریف نہیں کیا اور شیعہ خاص مجتہد کے نام، جس میں امور خلاف شرع کا اختیار کرنا ہو، ہرگز نہیں لکھا۔ یہ تمام قصص اور دروغ آرائی مرزا پانی مذکور کی ہے کہ حضور کی نسبت مذہب کی ہے۔ لیکن یاد آتا ہے کہ ان مرزاؤں نے بروقت حاضری بطریق حکایات و تذکرہ عرض کیا تھا کہ اپنے مذہب کے موافق حصول صحیح ہنگام والا کے لیے غور مافی ہے کہ حضور کے فعل صحت کے وقت اپنی طرف سے علم چار کر کے صحت کے شکریے میں حضرت عباس کی درگاہ میں چڑھائیں گے۔ اس کے سوا کوئی تذکرہ نہیں ہوا اور اکثر شقوں پر اپنے ذاتی معاملات میں شاعی مہری کرائی تھیں۔ لیکن مجتہد کے نام کوئی تحریر مہری خاص ہرگز نہیں لکھی گئی۔ شاید ان مرزاؤں نے اپنی کسی مصلحت اور مصلحت کے لیے حضور پر یہ افتراء کیا ہو اور تحریر بے اصل اور جھوٹی مرتب کر کے دی ہو اور مجہد مذکور نے اپنی ایک نہادی سے اس کو صحیح سمجھ کر شہرت دی ہو۔ ایسی صورت میں مجتہد کے نام جو شیعہ پیچھا ہے اس کا ملاحظہ ضروری ہے تاکہ معلوم ہو مضمون کیا ہے اور لکھنے والا کون ہے اور دریافت ہونے کے بعد اس قصہ کے انسداد کی مناسب تدبیر کی جائے کہ پھر کسی کو ایسے افتراء کی جرأت نہ ہو۔ لہذا لکھا جاتا ہے کہ آپ بہ مقتضائے دولت خواہی و خیراندیشی اس بدنامی اور اتہام کے دفع کرنے کے لیے انگریزی تحریر تمام ایجنٹ لکھو نہایت تاکید سے لکھیں کہ شیعہ جعلی مہری خاص مجہد مذکور ہے، جس طرح ممکن ہو، طلب کر کے جلد بھیج دیں۔ اس کام کے سرانجام سے موجب رضامندی ہوگا۔

۳ ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ کو مسٹر جاسمین ایجنٹ لکھو نے یہ پیام اہل کارہی

سلطنت اور حکومت کو گھٹایا:

"بالفعل کہ نقل قطبہ شہزادہ شاہجہاں آباد مغلوب نجل صاحب انکیت بہادر مرقوم بست و مشتم باو دسمبر ۱۸۵۳ء خوش نیازمند رسیدہ۔ نقل ارسال و کتاب فیض آب و التماس ی وارو کہ از حضور پندور بہ سلطان اعظم، مجتہد العصر ارشاد شود تا کیفیت باجرا و اصل شہزادہ شہری بادشاہ موصوف اگر باشد بظہر انور بگوماند و بہ نیازمند عنایت کرد۔"

ترجمہ: بالفعل کہ نقل قطبہ بادشاہ شاہجہاں آباد مغلوب نجل صاحب انکیت بہادر مرقوم ۲۸ دسمبر ۱۸۵۳ء نیازمند کے پاس آئی ہے۔ نقل اس کی ارسال ہے اور التماس ہے کہ حضور پندور کا حکم سلطان اعظم مجتہد العصر کے نام جاری ہو کہ کیفیت واقعہ اور اگر اصل قطبہ شہری بادشاہ موصوف ہو تو حضور میں پیش کریں۔

یہ کاغذات سلطان اعظم کے پاس پہنچے، انھوں نے مرزا حیدر گھوہ اور مرزا نورالدین بہادر کو یہ رقم لکھا:

مرزا حیدر گھوہ بہادر و مرزا نورالدین بہادر زانو اقبالہ۔

دیروز نقل پہچہ پیام در خصوصی استرداد و احتضار کیفیت شہزادہ کہ بوساطت سانی از جانب بادشاہ شاہجہاں آباد موسومہ اشعاف العباد رسیدہ بود۔ درود نمود و رقبہ کہ از کیفیت اس مطلقاً مطلع سازند۔ و چون بالفعل تکلیف در اس واقعہ شدہ جواب آئندہ فقیر نوشتہ ہوم، اگر روانہ نہدہ باشد و انہیں فرستد کہ بدین تصدیق و تعہد اصل شہزادہ ارسال پانچ لکھ عمارت۔ فقہ و السلام۔

ترجمہ: کل نقل پہچہ پیام دربارہ و انہی و احتضار کیفیت شہزادہ کہ آپ کی معرفت بادشاہ شاہجہاں آباد کی جانب سے میرے نام آیا تھا، وصول ہوا۔ امید ہے کہ اس کی مفصل کیفیت سے مطلع کیجئے۔ چوں کہ اس وقت اس شہزادے میں شک واقع ہوا ہے، میں نے جو جواب لکھا تھا اگر روانہ نہ ہوا ہو تو انہیں کہہ دیجئے۔ اس لیے کہ بغیر تصدیق اصل شہزادے کے جواب بھیجنا مناسب نہیں ہے۔

اس وقت کے جواب میں مرزا حیدر شاہ نے کہلیج واقعہ اس طرح لکھی:

دریں دلا کہ قطعاً تحریر جناب قبلہ و کعبہ مجتہد البصر و الزماں سلطان اعلم صحتی بر استقام و اختصار کہلیج نفس الامری درود۔ در وقت خاص پادشاهی بنام نای خود معرفت ایں جانب و دایم طلب نمودن، پانچ وقت موصوف کہ جب ترتیل بخشور پادشاہ گردون بارگاہ دارہ برون، موصول دست ایں جانب گردید۔ لهذا کہلیج واقعہ ایں معاملہ بہ زبان خاص صداقت بدیں عنوان تخریض نموده می آید کہ ہنگام محبت انضمام طالع بہ ملامت طبع بہ حق طوعت بندگان تا میں شای کہ زمانہ فہمچہ ایں جانب و استقام دارالامانہ فکرتہ بود۔ قطعاً وقت خاص تقدیر انضمام عادی حضور انجاز مشغول ملاحظہ رویاے صادق و گزارشات بدین حکم مبارک بدرگاہ فلک استواء جناب ملائک کتاب خیرات اس حضرت مہاس علیہ السلام پر تو خدای اہلال انگندہ و من بعد وقت حضور ایں جانب ہم حضور والا مجدد بہ بیان شرح البصیرت دولہب روضہ رویاے سجدہ مسطورہ و انکبار تکیہ مہانی عقیدت و دلا حضرت حضرات ظاہرات ائمہ ہدیٰ علیم الحیات والتسلیمات بادامت الا رضوان والسطوات بزبان اعوام بیان خود بشارت فرما شدہ مصحح عزم تمیز امام باڑہ جب تحریر نامی شیوہ دست غفرہ خاص آل مہا علیہ السلام و انما کلا تہ در اسما کہ درباری بر طبق سنت سیدہ بکرہ جدا طالع خود حضرت امیر حمزہ صاحب الزمان فرمودند و قطعاً وقت خاص بنام مجتہد البصر و الزماں باعداد لائی متالی مطابق اختیار مراسم دلاے اہل بیت عصمت و طہارت و بدوچ انجمن فلک امامت و حجازے قطع الزعدوان و دشمنی جناب



ولایت تآب اسلام آباد انتظامیہ تآب کل تآب مطلوب کل تآب  
 قاری پند و اندیشہ الیوریا... خود از دست مہارک حضور والا بانی  
 جانب مرحمت شد کہ سلطان اعلیٰ بہتد اخصر و اثرمان رسانید و  
 پائش بحضور باہر نور گزرا نیدہ شد و علم مہارک در ہاں زمان  
 نتیجہ ایی جانب بہ کمال صرف ہست و لا بہت بہ طیار کفایتہ  
 نمونہ علم ہی اولاد درست نمودن طفرہ بدست حق پرست خود و  
 اہتمام محبوب علی خاں پکارخانہ سلطانی طیارگشت و حضور والا بکمال  
 غلوس بر سر مہارک خود گزاشتہ و بہ مرزا نورالدین بہادر حمایت  
 فرمود تا بر نصب آن بدگاہ موصوف بتاریخ سوم محرم الحرام سنہ  
 جال رخصت فرمودند۔

ہاں معنی بر جمیع اعلیٰ و ادناے شہر بلکہ از روئے اختیار قلعت مہارک  
 بر ارباب لولی لالاباب صاحبان عالی شان انگریز بہادر ہم بخوبی  
 واضح و بخوبی است۔ چنانچہ مرزا نورالدین بہادر در ہی جاہ آمد،  
 بہتمام جم غفیر از اہل سادات و موہنین و اعزاء امرائے پانچین  
 ترک و شیل و شہم قبیلہ دانی موالیان اہل حق طاہرین و خاں  
 آستان اعلام دینی مہینہ بدوہ، آن علم ہم صورت علم را بدگاہ  
 حضرت علمدار پکار گوشہ بند اہدایہ السلام بدست جانب سلطان  
 اعلیٰ بہتد اخصر و اثرمان نصب کفایتہ و استغفر اللہ بچک کل  
 سوسے ادب بہ نسبت بادشاہ جم جاہ بزدان عقیدت فرمان خود  
 نیاوردند و طاوہ بر آن قلعت خاص تقدس اختصاص شای صدورہ نام  
 انتظام و قلعت دیگر اکی مرزا نورالدین بہادر بکمال نصب علم  
 مہارک دست بخوبی خاص ہم سرور کہ نقوش لطیف کتب بدہ  
 است۔ وہ شاہ عادل ایی دعا و دو چیز قبیلہ ایی دینی راست کہ

ساف و صریح خبر دینی پر عیاری و نصب علم مبارک از طرف حضور والا اند۔ بھر کیف قریرہ حق خاص نام مجتہد العصر والرائان و ہم نصب علم از جانب بادشاہ انجم سپاہ از قایت و وضوح و اطلاق بوجود اولیٰ باہرہ و برائتین سلسلہ از اجلائے بدیہات مثلی آفتاب نمرود است۔ کیف جتمل معاذ اللہ والعیاذ باللہ کہ حضور والا از اموریکہ ہاں وہم شیوع و اشتہار یافتہ باشد، احتکالے و افکارے فرمایند۔ مگر آنچہ صیح ایں جانب درآدہ کہ حق خاص بادشاہ حضور انکار قریرہ حق نام مجتہد العصر والرائان و ارسالی علم مبارک نام صاحب لکنت بہادر شاہجہاں آباد نصب قریرہ یافتہ، نکاتے ایں عبارت ایں ہم فتن و مقاصد قست و عتاد جیسے از اہل کادان سلطنت و دشمنان اہل بیت طہارت است کہ دالما پائش عتاد و حید کہاب شدہ در صد و عداوت و پر خاش و برہم سازی حراج کرامت اجزاج از طرف ایں جانب ہی ہوندم۔ چنانچہ از روے اخبار شاہجہاں آباد ہم واضح گردیدہ کہ در ایام عدم حضوری ایں جانب حضرات ملازم سلطنت کہ در کین بودہ اند، وقت فرصت از مشکلات داشتہ بیشتر غلطو معامدین دین و سرکردگان اہل کین و بعضی موافقان مخالف آئین بمعاہین تراشیدہ و لفظ و سراسر پوچ و لچر و اندراج کلمات اسات اب کہ معاذ اللہ از زبان ایں جانب آدہ باشد از سکوت بیت السلطنت کسوف طلب نمودہ و ہم برستے علی بعض از خود طیار کردہ بملاحظہ زندگان دارا دربان گزارانیدند و ہرم نامورست برآوردن نام نامی حضور والا از خطبہ صمدین و روز جمعہ بطریق ہنگامہ و بلوا باجماع مشائخ و علماء و چنان آں بادشاہ حکومتی صفات را تجھ و مجبور ساختند و طبع تاجیں را

از طرف اہل جانب متعطف سمجھ کر از ارسال شوق تمام  
 مجتہد العصر والزمان اہل دانش فرمایند تا آن مغویان فتنہ انگیز بہ دایکس  
 کتابین شوق از مجتہد العصر والزمان بہ جنگ و توفیق نصیب توفیق  
 پرداختہ باشند تا شایب جمعیت فریب و جعل دشمنان اہل جانب را کہ  
 ناکرہ گناہم بدنام نمایند۔ پناہ بخدا ازین سلسلہ پرداز یہاں ہے  
 اصل فرقہ متکثر مغویان بدکیش کہ آفتاب را بہ پردہ خاک می  
 پوشد و غی داند کہ ہر نوع اعتبار حق از باطل بھربگام و زبان  
 باغک شامل مقلدے نصفت آنھیں ہرمن و ظاہرہ کائنات فی وسط  
 ایسا باہری باشند ان الحق یلذ ولا یبطل۔ و قطع نظر از جملہ دلائل  
 مرقومہ بالا و موجود ہونہ شوق ہاست دست خطی شایب محفوظہ کلیتہ  
 ہذا کہ بشوق اکی مجتہد العصر والزمان مختلف اللفظ و متحد المعنی توان  
 گشت۔ ادبائے خیریت و بصیرت غور فرمایند و ہامعانی فکر تھمت  
 بکار برد کہ کہے کہ انھک مایہ از شعور و عقل خواہ داشت، حتی طفل  
 میوہ نابلغ بچہ گاہ بہ تعلیم و عقل خواہ پرداخت کہ بچہ گوند متوج  
 متوج و غی باشد، نہ مفاد و غی۔ پس بچہ عقل خیر اندیش  
 رخصت می دہد کہ اہل جانب اہل جنس جعل و فریب معاذ اللہ می  
 نمود و باحق دے ہر عمر مدلل عقیدہ با اختیار نصیب ردافض  
 نسبت بظہور والا شایع و مشہوری نمود، مگر ایک ادبائے خلاف و  
 اصحاب نصیب و معاذ جعل تمام دلائے جناب ولایت مآب علی نبی  
 الی طالب علیہ السلام حضور را بہ رفض منسوب فرمایند، قصور اہل  
 جانب چوہ؟ قال و قائل ان غولید معین الدین چینی است۔

من علی ما دوست دارم خلق گوید راغنی ست  
 پس خدا و جبرئیل و ہم جوہ راغنی ست

و یعلم المتقین غایت و مقصدی است کہ اگر حضور والا را بالذات لا  
 لعلمی روح غیبی جعل و فریب کاری نسبت ایی جانب ی بود لایق و  
 سزاوار باذہبی انکشاف من بود۔ بعد از اس محفل نگارش حکام فرمای  
 ردا بود۔ موبج مرام و مختصر کلام طوالت الہام آنکہ استرداد حق  
 خاص موصوفہ جانب مجتہد العصر والزمان تعمیر انکشاف و تحقیقات  
 حقیقہ واقعی دینی ہا زیادتہ قطعی ایی جانب از ثروت فریب  
 کاری و نظریہ توفیقی نسب حق الہیہ اشاعہ مشرعی مناسب و مصلحت  
 نیست چرا کہ بعد استرداد حق موصوفہ پنج گونہ حرف بدائی و  
 سوسے اہم رسوائی باقتساب جمیع جعل و انزوا پردازی مطویان  
 مخالف ایمان مذہبیات استرداد حق موصوفہ ی فرماید۔ پس سہم  
 استقامت ایی جانب و احقاق حق و الزامی ہائل در کتب متوجع  
 نیست، کلیتہا راست یقینی ایی بود کہ بقلم آمد و جواب حق  
 پادشاهی نوشہ سلطان اعلمی مجتہد العصر والزمان بحضور پادشاہ غیاث  
 رسانید شد، نزد ایی جانب نیست کہ سزدی فرستادم فقط و فقط عالم  
 محققہ اہل و صدق القال و انا متورع الہال تحریر فی الہدایہ  
 یاروم ضمیر خلقت بحر رفیع انسانی نہ یک ہزار و دویست و ہشتاد  
 ہجری نبوی قدسی۔

ترجمہ: اس وقت تحریر سلطان اعلمی سہم احتضار کلیتہا شدہ خاص پادشاهی  
 جو موصوفہ کے نام میری معرفت آیا تھا اور وہابی جواب حق موصوفہ، جو بخارہ روایتی  
 بحضور پادشاہ دیا تھا، وصول ہوئی۔ لہذا کلیتہا واقعی اس کی گفتا ہوں: جس زمانے میں  
 پادشاہ طویل تھے، میں کلکتے میں تھا اور مجھے شہسی شہت پہنچا۔ جس میں خواب کا بیان اور  
 حضرت مہاش کی درگاہ میں حکم چڑھانے کا مذکور تھا۔ اس کے بعد صپ میں حاضر ہوا تو  
 بحر خواب دیکھنے کا حال بیان فرمایا اور اہل بیٹ کی صہت کا اظہار اور امام باڑے کی تعمیر

کا قرضہ برائے تعویذ دہلی سیدالطہار اٹھل اپنے جڑاٹلی امیر تیمور صاحب قراں بیان کیا، اور ایک شہنشاہ خاص مجتہد اہصر کے نام لکھا جس میں دلائے اہل بیت و حرمائے قطعی دشمنان حضرت علی کا اہتمام تھا۔ خود اپنے دست مبارک سے مجھے دیا جو میں نے مجتہد اہصر کو دیا اور اس شے کا جواب حضور میں پیش کر دیا اور میری غیر حاضری میں علم مبارک نہایت اہتمام سے ایک نمونہ تانبے کا بنا اور بادشاہ نے اپنے دست حق پرست سے اس کا طعرا دیا اور محبوب علی خاں کے اہتمام سے کارخانہ سلطانی میں تیار ہوا اور حضور دلائے کمال غلوں سے اپنے سر پہ رکھا اور پھر مرزا نورالدین بہادر کو دیا اور دو گاہ موصوف پر چڑھانے کے لیے ۳ عزم سو حال کو انھیں رخصت کیا۔

اور یہ بات تمام اہل و ادائے شہر پر نکلے از روئے اخبار قلندر مبارک، صاحبان انگریز پر بھی بخوبی واضح ہے۔ چنانچہ مرزا نورالدین بہادر نے یہاں آکر سادات و مومنین اور امرا کے جلسوں کے ساتھ حضرت عباس کی دو گاہ میں اس علم کو پہنچایا اور سلطان اعلیٰ سے اس کو نصب کرایا۔ استغفر اللہ، کوئی نکلے بے ادبی کا بادشاہ کی نسبت نہیں نکلا۔ اس کے علاوہ ایک شہنشاہ میرے نام اور دوسرا مرزا نورالدین بہادر کے نام جس میں علم چڑھانے کی تاکید ہے اور ان پر غسل کے دست خط ہیں، ان کی حکمتیں لطیف ہیں، یہ دونوں شے دو گاہ حادل اس بات کے ہیں کہ علم کی تباری اور اس کا چڑھانا بادشاہ کی طرف سے ہے۔

بہر کیف، تحریر شہنشاہ خاص تمام مجتہد اہصر اور علم کا چڑھانا بوجہ وضاحت و اعلان بدیہی طور پر مثل آفتاب شہروز کے بادشاہ کی طرف سے ثابت ہے۔ پھر یہ حال کیونکر ہو سکتا ہے کہ مولانا حضور دلائے ایسے امور سے، جو اس قدر شائع ہو چکے ہیں، انکار فرمائیں۔ مگر میں نے جو سنا ہے وہ یہ ہے کہ شہنشاہ خاص کی تحریر شے اور علم کے بھیجنے سے جو انکار صاحب اکثرت شاہجہاں آباد کے نام لکھا ہے، غلط اس کا انکار انہی سلطنت اور دشمنان اہل بیت ہیں کہ ہمیشہ آہل حق و حاد اور حسد سے جل کر عداوت اور پرخاش اور مزاح شای کو میری طرف سے برہم کرنے کی تدبیریں ہیں۔ چنانچہ

شاہجہاں آباد کی خبروں سے معلوم ہوا کہ میری فیہت میں حسب لازمی سلطنت نے، جو گھات میں تھے، بہت سے خطوط سراسر غلط اور لہجہ مضامین کے اور نیز یہ کہ میری زبان سے کلمات بے ادبی ظاہر ہوئے، لکھنؤ سے منگائے اور بعض جعلی تقریریں خود بنا کر بادشاہ کے حضور میں پیش کیں، اور بطریق ہوا وہاں کے ملا و مشائخ کے اصرار سے ہمد اور عیدین کے خطیوں سے بادشاہ کا نام نکالنے کی تدبیر کی اور اس طرح بادشاہ کو تنگ کیا اور میری جانب سے طبع ہوائیں کو اس طرح بھیجا کہ شوق مجتہد بصر کے نام روانہ کرنے کا انکار فرمائیں اور مذہب شیعہ کی توہین کے لیے شوق مجتہد بصر سے واپس منگا کر فریب اور جعل سے مجھے بدنام کریں اور متعدد پردازیوں سے خدا کی پناہ کہ مولویان بدکیش آفتاب کو خاک سے بچاؤ چاہتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ مصلحت حق اور باطل میں تمیز سے غور سے فیض کر لیتے ہیں۔

قلعہ نظر مرقومہ بالا دلیلوں سے شوق شامی، جو مخلوق ہے، یہ مجتہد بصر کے شوق سے مختلف الفاظ مکرر معنی اور مطلب ایک ہے۔ ارہاب خبرت و سمیرت غور کریں کہ جس کو تمیز اسامی شعور ہے، حتیٰ کہ طفل تاوان بھی ایسے جمل کو نہ مانے گا، جس میں کوئی قطع نہ دینی ہو نہ دنیوی، بھر عقل غیر اندیش کب اجازت دے سکتی ہے کہ معاذ اللہ، میں ایسا جمل و فریب بھانا اور جملی عقیدہ اور مذہب رفض کے اختیار کرنے کی خبر حضور والا کی نسبت مشتہر کرتا۔ مگر یہ کہ دشمن عدا کی وجہ سے محض جہت حضرت حق کے نام سے حضور کو رفض سے منسوب کریں، اس میں میرا کیا قصور ہے۔

علیٰ المرتضیٰ سے ثابت اور متقن ہے کہ اگر حضور والا کو بالذات میری طرف سوء ظن جعل و فریب کا تھا تو اول مجھ سے باز پرس چاہیے تھی۔ اس کے بعد حکام کو لکھا جاتا۔ مقرر یہ کہ شوق خاص مسوومہ مجتہد کی واپسی بطور تحقیقات اور میری برأت کے اور نیز توہین مذہب امامیہ کے خیال سے مناسب نہیں ہے، شوق کی واپسی کے بعد جعل کی جہت سے میں بری نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ حضور والا مخالف الایمان مولویوں کے اقوال سے مدعیان واپس شوق کی چاہتے ہیں، بھر میرے استغاثے کی سماعت اور احتیاق حق و

ازہائی پائل کی کوئی امید وہاں نہیں ہے۔ عمروہ ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۷۰ ہجری  
یہ کیفیت مرزا حیدر گلکو بہادر نے سلطان اعلیٰ کی خدمت میں پیش کی۔  
جناب موصوف نے اپنی ذیل کی کیفیت کے ساتھ اس کو بادشاہ اودھ کے پاس بھیج دیا۔  
فصل کیفیت سلطان اعلیٰ:

کیفیت حال بدین منوال است کہ مرزا حیدر گلکو بہادر و نور الدین  
بہادر از زمرۂ شاہزادگان سلاطین شاہجہاں مستند۔ از بارگاہِ قہار  
دارالسلطنت شاہجہاں آباد حرمت من المکن و الفساد شہ سوئے  
اضعف العباد آوردند و تحصیلِ حاصل از کیفیت مرسلۂ ایچان کہ  
موصولہ امیں کیفیت است واضح رہی شود و اخیالِ قیہ کہ در آں  
کیفیت مذکورہ گردیدہ، مسجد نیست۔ چنانچہ در زمانِ ماضی ہر گاہ  
بادشاہِ غفراں چاہ حضرت بہادر شاہ ظاہر و جمل المکن کہ از  
جملہ اجداد و امجاد و تمام بادشاہ قہار حال بودند اند و خطبۂ فضل و  
کمال آراستہ و بزرگ تشییع و قلمائے آل عزت و جرات در عہدہ طور  
طوائف لادور راجع ساختہ خطبہ المہمب جناب ولایت کاب  
حضرت امیر المومنین۔ و بموجب الدین اسد اللہ الغالب علی ہندی  
ابلی طالب را ثابت فرمودند و محبت بر ایچان تمام نمودند و خطیب را  
باسور ساختہ کہ خطبہ شاہزادۂ عظیم ایچان یہ مسجد جامع رفتہ در  
خطبہ کھڑے علی ولی اللہ و وحی رسول اللہ سلائے خیر بخواند۔ چوں  
شہزادۂ مذکور از عجب اعلیٰ بیت بر اعلیٰ دور بود ایما بکلی خطیب  
نمود۔ آں سعید شہید گردید و بہ سبب بلوۂ معاصرین ترویجِ دین  
مکن نمود۔ چنانچہ در کتب سیر و تاریخ مذکور و مسطور و برہنۂ  
بہرور دائر و مشہور است، و حال زمانِ ماضی مشاہیر حال زمانہ حال  
است کہ چوں ضرر ورود حق شای نگاہ برآ و حق رسید و حکم

مہارک نیز شوق کشا گردید۔ عوام کمال فحاشی و اناکریوں کا قریب رہا اور  
مکاتیب و غیر مکاتیب مشترک نمونہ غفلت عظیمہ اور شاہجہاں آباد  
اعمال و عوام کے فساد و فحاشی کا ایک نیا نمونہ بن گیا۔ اس زمانہ میں  
مشترک گردید کہ ارباب عوامی خواہند کہ نام نانی و اسم سانی  
بادشاہ و مہاراجہ از خطبہ بیرون آئند و سامانی ہنگامہ بلوہ و مہاراجہ سازند۔  
ہر چند وہیں زبان اسن و لہجہ کہ نام خشی انتظام و محتاجی رقیق و  
حقن مہام ممالک محروسہ بلکہ اقتدار صاحبان عالی شان نصرت  
نشان عظمیٰ انگلستان ہی باشند، احمدیے از رعایا و برابرا محال اس  
معاذ کہ ہنگامہ فساد و فحاشی بکاد ہر پارسا سازد و نام نانی را از  
خطبہ جمعہ و عیدین برآورد۔ لیکن باز ہم ہر رعایت عزم را احتیاط  
احتمال تکیہ کا بر قریب از بلوہ عام عوام بلکہ انتظام از خواص ذوی  
الاحترام مثلی شاہزادگان و ملا جلا و مخدومت عالی مقدار و اراکین و  
اساطین کبار کہ ہنگامہ نامن حد و عذر تہذیب و تحضیب در تفسیر  
دارند گنہائش دارد۔ بہر حال بدون تحقیق و تحقیق جعل و تدلیس مقام  
استرداد حق مذکور نیست کہ مثالی تحقیق است۔ فرقہ ہم ہنگامہ لغت  
خلوں میں جاتی اربعین ۱۲۷۰ ہجری۔

ترجمہ: کلیتہً حال یہ ہے کہ مرزا حیدر شاہ بہادر و مرزا نور الدین بہادر  
سلطینی شاہجہانپور کے شاہزادوں میں سے ہیں۔ بادشاہ شاہجہاں آباد کی جانب سے  
میرے نام شوق لائے اور اس کی کلیتہً شاہزادوں کی مرسلہ قریب میں موجود ہے۔ تجھے کا  
احتمال مسجد نہیں ہے۔

چنانچہ گزشتہ زمانے میں حضرت بہادر شاہ نے کہ صاحب علم اور شہید تھے  
لاہور میں اپنے عہد میں ملا کو جمع کیا اور حضرت علی کی امامت کو ثابت کیا اور خطبہ کو  
ماسود کیا کہ شاہزاد عظیم الشان کے ساتھ جامع مسجد میں جا کر خطبہ میں کلمہ علی ولی اللہ



وہی رسول اللہؐ خبر پر کہے۔ شاہزادہ مذکور کو اہل بیت سے محبت نہ تھی اس نے خطیب کو قتل کرادیا۔ دشمنوں کے ہمارے سے قریب دینی نہیں ہوئی۔ چنانچہ کتب سیر و تاریخ میں ذکر موجود ہے اور عام طور پر مشہور ہے۔ زمانہ گزشتہ کا حال حال کے زمانے کے ہے کہ جب شیعہ کے آنے کی خبر جوان اور بڑھوں کے کان تک پہنچی اور علم مبارک بھی آیا تو عوام کا انعام نے بھولی باتیں قریر اور تقریر سے منتشر کر کے شاہجہاں آباد میں شورش کی۔

یہاں تک کہ اس شہر میں بھی یہ خبر مشہور ہوئی کہ دشمن نام نای بادشاہ کا خطبہ سے نکالنا چاہتے ہیں۔ گو اس امن و امان کے زمانے میں، کہ انتظام ملک کا صاحبان انگلستان کے ہاتھ میں ہے، رعایا میں سے کسی کی مجال نہیں ہے کہ وہاں ہنگامہ و فساد برپا کرے اور نام نای کو خطبہ جمعہ و عیدین سے نکالے۔ لیکن بوجہ احتیاط کے احتمال ترقیہ ضرور ہے تاکہ عوام کے سوا طوائف سے بھی مثل شاہزادگان اور مملکت کے جو منصب سنی ہیں، فساد کا اندیشہ نہ رہے۔ بہر حال، بطور تحقیق اصل شیعہ کے دامن بھر نہیں ہے۔ غور اور تاریخ الثانی ۱۲۷۰ ہجری

معلوم نہیں ہوتا کہ نتیجہ اس خط و کتابت کا کیا ہوا۔ ظفر (بہادر شاہ بادشاہ) نے ایک فارسی مثنوی مرزا غالب سے لکھوائی اور اس کو اپنے شخص سے شائع کیا۔ داہد ملی شاہ پر بھی یہ ایک حملہ تھا۔ آئندہ اس کا ثبوت بھی مل جائے گا کہ یہ مثنوی مرزا غالب کی ہے۔

"گزشتہ نمبر میں جس مثنوی کا ذکر کیا گیا تھا وہ حسب ذیل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ظفر شاہ (بادشاہ دہلی) نے اہل سنت امرا اور ایمان اور عوام میں اپنی بدنامی دیکھ کر اس کو دور کرنے کے لیے ایک مثنوی فارسی میں لکھوا کر شائع کی جس میں اطلاع اس الزام کی تردید اور حسب اہل سنت کی مدح و توصیف ہے۔

بلکہ ہاں اسے دقیقہ اندیش

حق پر جان و دولت کیجاں

قرآن مجید دین و دنیا کے لیے  
 راز و نیاز دین و دنیا کے لیے  
 شہادت ہے کہ ہر حادثہ نیست  
 تو یہ کلمہ حوالہ نیست  
 یافت ہر کس کہ بحسب عنوان  
 غنی تا ۱۰ یافت اور غنا  
 زان کلام تا صلی اللہ  
 بعد ہر دیدہ و نہی اللہ  
 شد ۱۰ غیر دے ایسی دلیل دست  
 کہ نیاکان ما ز روز نخست  
 یا گرائی کبیراں بودند  
 یا گرائی بایہ سرداں بودند  
 زان پس روزگار ہائے دواز  
 در سراپدہ ہائے عزت و تاز  
 بود ہر کس بہ کشور آرائی  
 تا ۱۰ چنگیز خان مسیحائی  
 چوں قراچاد دم زد از اسلام  
 بکہ قوم یافت نام تمام  
 بعد ازاں تا ۱۰ ما کہ بظفریم  
 ہمہ فرماں دہان و داد کریم  
 چچ کس دم ز احتراں نہ زد  
 گام بر مسکب چہاں نہ زد

دشمن ہرگز نگاہ نہ ایم  
 حکمِ رسولِ خدا نہ ایم  
 ہم ما نیست نامزدا حق  
 کار ما نیست جز شا حق  
 خانہ دلو رسول و آل و ہم  
 دشمنی ہم بدستال و ہم  
 خانہ زاد نمی و آل نمی  
 کلمہ با صحابہ ہے اولی  
 رانکہ ایسا امن و داد گراہ  
 با نمی محققین و ہم سزاہ  
 کیش بیجاگی رہا کردہ  
 بر نمی مال و جاں فدا کردہ  
 ب دلائے نمی و عزت او  
 یافتہ ملک و دیں بدولت او  
 بدستال صحابہ ہے دین است  
 در طور صد ہزار قرین است  
 کار اصحابِ بین و بد مشر  
 حال ایچاں چہ حال خود مشر  
 کر ترا صرفہ کو کاریت  
 حبت ایچاں طراز دیداریت  
 رخص ماغولیاے عام آرد  
 سید دیباگی ہمام آرد

یا تو کویم اگر یقین داری  
 کاہی بزرگان نہ دے دینداری  
 غیر خواہ رسول و آل دے اند  
 حاجت جلوہ جمال دے اند  
 وحتاں را شمرہ دشمن  
 در طور سرافش قویٰ یا من  
 انچه اندیشہ نہائی تست  
 ہر از دے بدگئی تست  
 کار دی مشکل است آساں نیست  
 بدگائی طریق ایمان نیست  
 پیش ازین آہنناکہ ما کھیم  
 حرف از راز برلا کھیم  
 تاج و تاج و تاج خود از ما بود  
 دولت و ملک و دین خود از ما بود  
 آں تہرزد بہ حبہ گر ایں ماند  
 ملک اگر دولت کو برد وین ماند  
 اندری روزگار گر شب و روز  
 ما اندریم طالع خیر روز  
 حاصل ما ست با ہر غم و ہج  
 کوشہ تو شہ و دیگر ہج  
 بہ شکوی و غلت الدنی  
 بست بر من طلا چہ آئینی

کس قلعہ ہیکہ بر تہانہا رفت  
تا اودہاں قلاں نکانہا رفت  
دیده باشد کہ شہریار نہ ایم  
کارفرمایے بند و دار نہ ایم  
بسی من بجز ریاست نیست  
بہر من پایہ سیاست نیست  
لازم رفت و ہر چہ خواست سرود  
نادا گفت خود و نہ راست سرود  
بر چینی کس ہزار فقری دادا  
لغت از حق، رطل آہی دادا  
زمی کہ توجیح من نوشت بہ چہل  
خاطرم راست اندر آفتاب فعل  
حاشا اللہ کہ پیچہ سببیں  
سزہ نفس داد و دانش و دہی  
پیچہ را کہ ساخت خود بہ ستیز  
چوں توانہ شمرہ دست آویز  
ماو حق را بہ حرف نواں بست  
خود را گویہ طرف نواں بست  
آں یکے کز خدا نداشت خبر  
سر نی یا شمرہ چادرگر  
چوں نہ کردہ رہا رسول خدا  
من لسان الہی کفایت اند

گرچہ میں مکن یزور نقواں ہست  
 جسکے را کہ مرد نادان ہست  
 ایک بدنام کرو د داد لست  
 کہ د خون رہنختن لپاؤ لست  
 بخودم خونی دل د عشق چا  
 کہ روو بر مکن این حدود د مرا  
 نیست ما را درمی گزرد کہ نگ  
 کہ گھیم مکن د روو سرہنگ  
 تا زبان از قضا بروں کھدش  
 چوں بخورد بھاک د خون کھدش  
 یا کھیرد خواہ د زار کند  
 داؤگوں بر خوش سوار کند  
 زویہ کرد شہر گردانہ  
 کرت کرد جہر گردانہ  
 در تو کوئی حال د یا را نیست  
 جانکاں راست گرچہ ما را نیست  
 دہر ما جانکاں داؤگر اند  
 کہ دہر کسی ہما پیشتر اند  
 ہر کہ بد کرد کھیر بد آن است  
 قل گر نیست بند و زندان است  
 لاجرم مکن کہ بادشاہ احتم  
 خوش دلاور داد خواہ احتم

عجب چل کھلے گئے  
 بحر ہرگز گئے گئے  
 چل ساری د فتنہ ہزاری  
 جرم دانی و نظری ہاری  
 راسے حکام دہر تا چہ بد  
 ایں چنیں جرم را سزا چہ بد  
 گر جہانگیر را جہانگیر  
 چہ ایساں ملک مسعود  
 ہرگز! ملک و دینی خداوند است  
 داد خواہم و کار ما داد است  
 نامہ را ختم کن کہ پایاں رفت  
 دعا صورتے نمایاں رفت  
 خلا را از خود دعا بفرست  
 دینی نمودار جاہا بفرست

اس مثنوی کی شہرہ زباں، فصاحت و بلاغت، طرزِ ادا اور اسلوبِ بدیع کو ملحوظ رکھ کر ادبی کی نظر میں غالب کی یہ دہ دہی کرتا ہے، تاہم آنکھ کے واقعے سے معلوم ہوگا کہ لکھو اور دوبار لکھو کو اسی زمانے میں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ یہ پُرلہرو دینی رجحان، ظفر شاہ کی ملکیت نہیں، بلکہ شیخ الہم علی مرزا اسد اللہ غالب کا مقولہ ہے۔

## ”مرزا غالب کے ایک قصیدے کی شانِ تصنیف“

طاہر کریم تا آں ستم کش کاروں جی  
 کہ دوسے آدم آں مہا را سارباں جی

یہ قصیدہ کلیاتِ غالب میں موجود ہے مگر اس کو بھی مذکورہ بالا واقعات سے ایک کون تعلق ہے واپس علی شاہ کو خواب میں جناب سید الشہداء علیہ السلام کی طرف سے بشارت ہوئی کہ ہم خاکِ شفا حمادے لیے بھیجے ہیں۔ نحب اشرف کے مجتہد صاحب کو بشارت ہوئی کہ خاکِ شفا لکھو بھیجی جائے۔ کربلا سے خاکِ شفا کی ضرورت بڑے اہتمام سے روانہ ہوئی، لکھنؤ میں جو واسطے کی تاریخ تھی اس روز واپس علی شاہ نے سلطان العلماء کو یہ رقم لکھا:

دریں دلا حسبِ اجازت و ایما سے مولا سے جہاں و جہانیاں حضرت  
ابا عبد اللہ الحسینی شہیدِ معینِ مظلوماں کہ پہ مجتہدِ نحب اشرف شدہ  
و از آسما معرفتِ سلطانِ العلماء مجتہد العصر والزمانِ ہدائی دولت  
حضرت صاحب الزماں بہ سہبِ عارضۂ تحفانِ پیادہ روی  
کی داد۔ و لہذا نور چشمِ ایں دودمانِ برخوردار صاحبِ عالم و  
عالیانِ مرزا ولی محمد بہادر و برخوردارِ جرنیل صاحبِ بہادر و دیگر  
شاہزادگانِ ایں خاندانِ را حکمِ دادہ کہ نجابتِ استقبالِ ہوازدہ و  
ایشان ہم شریکِ استقبالِ شدہ تا بقائد رسانند، عہدۂ باجور خواہ  
شد۔ بتاریخ ۲۶ شعبان ۱۲۷۰ ہجری یوم پنجشنبہ یک نیم پاس روز  
باقی ماندہ سیاہ پیش شدہ بہ کربلا سے دیانتِ الدولہ بہادر حاضر  
شود۔

ترجمہ: حال میں جو اجازت حضرت امام حسین علیہ السلام کی مجتہدِ نحب اشرف کو ہوئی، اور ان کے یہاں سے پذیرۂ سلطانِ العلماء کے مجتہدِ نحب اشرف کی۔ میں چوں کہ سہبِ عارضۂ تحفانِ پیادہ روی کی طاقت نہیں رکھتا، اس لیے برخوردارِ صاحبِ عالم و عالیانِ مرزا ولی محمد بہادر اور دوسرے شاہزادوں کو حکم دیا ہے کہ میرے قائم مقام ہو کر استقبال کریں اور خود یہ لوگ بھی شریکِ استقبال ہو کر



گھر تک پہنچائیں اور خدا سے ثواب حاصل کریں۔ ۲۶ شعبان ۱۲۷۰ھ ہجری بمقامِ پنجشنبہ آدھ گھڑی دن رہے سیاہ پوش ہو کر دیانت الدولہ بہادر کے کربلا میں حاضر ہوں۔

اس حکم کے موافق ضریح خاک شفا بڑی دھوم سے لکھنؤ میں آئی، قالب نے یہ قصیدہ لکھ کر سلطان احمد کو بھیجا، سلطان احمد نے قصیدے کو اس سفارش کے ساتھ واجد علی شاہ کے سامنے پیش کیا:

از آنجا کہ آوازِ رسولی بشارت موصول ضریح مبارک خاک شفا از کربلا سے پہلے بمقامِ بندگاںِ اقدس و اعلیٰ ادریں بیتِ المصطفیٰ پیش آہادۃ دارالحقائب شاہجہاں آباد رسید۔ اسد اللہ خاں قالب دہلوی کہ در لہجہ شعر و سخن یکساں در فصاحتِ نظم و بحر ہے ہوتا و ہادیہ نظیری نظیرے نہ داند۔ اگر کلامش مقبول بارگاہِ خاقانی شود، ہم پائے خاقانی ہا شد۔ دریں ولا قصیدۂ خزاں در مدحِ ضریح بطریقِ فصیح و بجا، فصیح انکس و انکس ممود و ہادۃ مدحِ گری و شاکستی بندگانِ سکندر شان را ہلام اقدام ممود۔ بمقام:

خداۃ جہاد تیرجل من جہاد

تو سلیمانی کن اسے عالی نژاد

بطریقِ ہدیہ محقر رہی گرد۔ بکھنور پہلے گزرا تہذیب، سہذا دای کہ در اسور خیر ساقی ی باشد، یہ بارگاہِ قلب جاہان را ارسال داشت۔ کہ قبولِ عقد نہ ہے عز و شرف۔ و چوں حطمتی مرشد و اشعارِ مکیہ است۔ قالب کہ بمقامِ فقرۂ شریف کہ در حدیثِ ثواب نکا و باکی دادہ کشت۔ غفر اللہ و ذلہ و ولوکانت مثل زہدِ اختر۔ باعثِ علو و غفران لغرضِ قدم و لرزشِ گلم کہ در مشقِ سابق لائق شدہ بود گرد۔ رہاے دائمی کہ ہواہر ہادیہ ممدوح ممدوح مرامِ سلطانہ و محتایاتِ خاقانیہ از پیش گاہ بارگاہِ تمجید ہودہ باشد۔

توجہ: چون کہ اعلیٰ حضرت کے لیے ضریح مبارک خاک شفا کے پہنچنے کی خوش خبری اس دارالسلطنت سے شاہجہاں آباد کو پہنچی، اس لیے اسد اللہ خاں قالب نے جو بے مثل شاعر ہے، ایک قصیدہ مدحِ ضریح میں لکھ کر اور اعلیٰ حضرت کی

ٹھیکسری بھی کر کے اطمینان دے دئے محقرہ کے، جو بعد قبول کے حقّ مؤقرہ ہو جائے گا۔ حضور صلیٰ علیہ وسلم میں بیٹھ گیا۔ اس لیے خاکسار نے، کہ بیٹھ ٹیک کاموں میں سہی کرتا ہے۔ وہ ہار نہیں اس کو روانہ کیا۔ مگر قبول افتد نہ ہے عود شرف۔ چوں کہ اس میں مرثیہ اور دلانے والے اشعار بھی پائے جاتے ہیں، عین قالب ہے کہ لخواے اس حقّ شریف کے کہ صحتِ ثواب بکا و پاکی میں وارد ہوا ہے (یعنی خدا اس کے گناہ کو گواہ سمندر کے بھاگ کے برابر ہوں معاف کر دے گا) پہلی مثنوی میں جو لغزش ہو گئی ہے وہ معاف ہو جائے گی۔ امید ہے کہ مدح کو ہمیشہ موردِ مراجع سلطانے رہے گا۔

اس عرضداشت سے ظاہر ہے کہ وہ قاری شکی مرزا قالب سے کھوئی تھی، اس کے بعد اولیٰ کا خط سلطان اعظم نے مرزا قالب کو لکھا:

مشہور خاطر قواد کاثر باد کہ خوشتر در پارح نمینہ عید نکو بے مشعر بر ایصال  
معروضہ مع قصیدہ فریدہ چہ چنگا و سلطانی فرشتہ ارسال داشت ام، منقذ آست کہ ظفر  
شریف رسیدہ باشند۔ دیگر پانچوں ہنوز نہ رسیدہ۔ بالفصل ہر تازہ کہ قاطل اظہار مست  
ایک قصیدہ موصوفہ... شیلے پیو خاطر مبارک ہنگام دارا و دہان الماد۔ و تحریج قبول بر  
نچ مامول دست داد و ایضاً بے عطائے ارسال خلعت کاکن از بارگاہ سپہر اشتہار صادر  
شود۔ اما خیال ایکہ چوں آں ناظورہ ہستای خندانی ہاتھیہ دو دمان صاحب قرانی دست  
اورنگ گورگانی تعلق و توشلے داری، مبادا ایبارغ ایں صلیٰ شریف خلعت مزاج آں بادشاہ  
تجہاد و باصیت برہمی دکھلے مژدہ ساری شود لہذا دریں باب توقف نمودہ شد۔ الحال ہر  
چہ مشورہ ساری گرای شد بمثل آمد۔ حررہ ۱۲ ذیقعدہ ۱۰۷۰ ہجری

قریب: آپ کے خط کے جواب میں ایک معروضہ لکھ چکا ہوں جس میں یہ  
اطلاہ دی ہے کہ ایک معروضہ مع قصیدے کے بادشاہ سلامت کی خدمت میں بھیج دیا  
ہے۔ یقین ہے کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا، مگر اب تک اس کا جواب نہیں آیا۔ اس  
وقت قاطل اظہار بات یہ ہے کہ قصیدہ حضور کو بہت پسند آیا اور خلعت فاخرہ کے عطا  
کرنے کا حکم صادر ہوا، لیکن اس خیال سے کہ آپ چوں کہ خاندانِ صاحبقرانی سے تعلق

رکتے ہیں، اس لیے ایسا نہ ہو کہ اس صلیب کا بھیجنا مخالف مزاج اس بادشاہ کے ہو اور آپ کے وطن، مقررہ میں کوئی قتل پیدا ہو۔ اس معاملے میں توقف کیا گیا۔ اب جو آپ کی رائے ہو اس پر عمل کیا جائے۔ ۳۴ ذیقعدہ ۱۲۷۰ ہجری

## غالب کا اردو سلام

اسی مجھ سے ("دستور العمل اودھ") میں غالب کا ایک سلام بھی درج ہے:

سلام اُسے کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو  
 تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سنا کہیں اس کو  
 نہ بادشاہ نہ سلطان، یہ کیا سنا کہیں ہے  
 کہو کہ خاص آلِ عبا کہیں اس کو  
 خدا کی راہ میں شای و خسروی کیسی  
 کہو کہ۔ رنجِ راہِ خدا کہیں اس کو  
 خدا کا بندہ، خداوندگار بندوں کا  
 اگر کہیں نہ خداوند، کیا کہیں اس کو  
 فرداغِ جوہر ایماں، حسینِ ہنِ علی  
 کہ صبحِ انجمنِ کبریا کہیں اس کو  
 کفلیِ غصتی، نصرت ہے بنِ نہیں ہزنی  
 اگر نہ شایعِ روزِ جزا کہیں اس کو  
 مسیح جس سے کرے امتِ نبی ہاں بخشی  
 ستم ہے، کشتِ تلخِ جفا کہیں اس کو  
 حد کی سببِ رضا میں جگہ نہ پائے وہ ہمت  
 کہ جن و انس و ملک، سب بجا کہیں اس کو

بہت ہے، پانچ کرو رو حسین پلہ  
 بھڑا فہم ہے مگر کیا کہیں اس کو  
 غلام سوز ہے یاں تک ہر ایک درد خاک  
 کہ لوگ جویر تلخ تھا کہیں اس کو  
 ہمارے درد کی یارب کہیں روا نہ ملے  
 اگر نہ درد کی اپنی روا کہیں اس کو  
 ہمارا منہ ہے کہ دیں اس کے حسن مہر کی ہمارا  
 مگر نئی و حق، پیشوا کہیں اس کو  
 وہ دیکھ تھوڑا دواؤ پہ کام فرما ہے  
 کہ طالبان خدا رضا کہیں اس کو  
 امام وقت کی یہ قدر ہے کہ اہل عباد  
 پیارہ لے چلیں اور ناسوا کہیں اس کو  
 یہ ایجاد مجب ہے کہ ایک دشمن دیں  
 حق سے آ کے لڑے اور خطا کہیں اس کو  
 بزدل کو تو نہ تھا ایجاد کا پایہ  
 برا نہ ملے، مگر ہم برا کہیں اس کو  
 حق کے بعد حسن اور حسن کے بعد حسین  
 کہے جو ان سے برائی، بھلا کہیں اس کو؟  
 نبی کا ہو نہ جسے اعتقاد کافر ہے  
 رکھے امام سے جو بخش، کیا کہیں اس کو  
 بھرا ہے عقاب دل غصہ کے کام میں درد  
 غلام نہیں ہے کہ غولی لوا کہیں اس کو

## مرزا تقی اور ”اودھ اخبار“

مرزا ہر کو پل تقی قاری کے مستند اور کاور انکلام شاعر تھے۔ ماہر عربی غالباً سے تقی کے بارے میں کئی لغزشیں سرزد ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ تقی کا سارا کلام قاری تک محدود ہے اور یہ کلام بھی لوگوں کی نگاہ سے ابھل ہو گیا ہے۔ جناب مانگ رام صاحب لکھتے ہیں کہ تقی نے:

قاری میں بہت بڑا دشمن اپنی یادگار چھوڑا، چار دیوان ہیں۔  
 دیوان اول ”اسحا الاخبار“ آگرہ میں چھپا۔ اس کے صرف ۳۰۰  
 نسخے چھپے تھے۔ اس کا چھاپا ۱۸۳۸ء میں شروع ہوا اور یہ ۱۸۳۹ء  
 میں شائع ہوا تھا۔ دیوان دوم مطبع کوہ لاہور میں چھپا تھا۔  
 دیوان سوم کا کچھ چائیں چلا۔ اس کا نسخہ کہیں دیکھنے میں نہیں  
 آیا۔ دیوان چہارم کا چھاپا مارچ ۱۸۶۹ء مکمل ہوا۔ یہ غنی شیعرائیں  
 آرام کے مطبع ملہو غنائی آگرہ میں طبع ہوا تھا۔ تقی نے سورتی  
 کی برستان کے تنجی میں ایک مشہور کہیں جس کا نام انھوں نے  
 غالب کے کہنے پر ”مستطابان“ رکھا۔ یہ مشہور ۱۲۷۷ ہجری میں  
 مکمل ہوئی۔<sup>۱۵۶</sup>

شہزی کیلئے کا سبب مالک رام یوں بیان کرتے ہیں:

مولوی غفور علی کا جہاں سال بیٹا محمد سلیمان انھیں داغ مفارقت دے چکا تھا اور وہ اس کی جان بچائی سے بہت دل گرفتہ اور مغموم رہتے تھے۔ انھوں نے قلعہ سے فرمائش کی کہ وہ ایک شہزی قلم بند کریں جس میں محمد سلیمان کا ذکر ہو، تاکہ اس کی یادگار قائم رہے اور وہ خود اس کے پڑھنے سے اس کی یاد تازہ رکھ سکیں۔ چنانچہ جس طرح انھوں نے اپنے بیٹے پختہ سنگھ کی وفات پر گلستان کی قصیدیں لکھی تھیں، محمد سلیمان کے لیے یوحنا کے جواب میں ”سلطان“ قلم بند کی۔ یہ پہلی مرتبہ لکھنؤ سے ۱۲۸۲ھ (مطابق ۱۸۶۵ء) میں شائع ہوئی۔ ۳۵

جناب مالک رام صاحب کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ”سلطان“ پہلی مرتبہ ۱۸۶۵ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ دراصل ”سلطان“ جیسا کہ آگے چل کر ”ادب انبار“ سے معلوم ہوتا ہے، پہلی مرتبہ میرٹھ میں بھیجی تھی۔ اس کی تاجیہ غالب کے ایک خط مورخہ ۲۰ جنوری ۱۸۶۱ء سے بھی ہوتی ہے، غالب قلعہ کو لکھتے ہیں:

صاحب احمدا خط میرٹھ سے آیا۔ ”سلطان“ کا چھاپا خاتم کو مبارک کرے اور خدای تعالیٰ تمہاری آبرو کا نگہاں رہے۔ ۳۶

قلعہ کے محبوب بیٹے پختہ سنگھ کا انتقال بارہ برس کی عمر میں ہوا۔ اس کی بے وقت موت نے قلعہ کو ایسا عروان و مغموم کیا کہ اس کے فراق میں عمر بھر حال رہے۔ انھوں نے پختہ کی یاد میں ”قصیدہ گلستان“ لکھی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

خنِ رام و پختہ در آں جا  
 در الخاتم و چشم تر در آں جا  
 چہ کریم در خنِ الزلزلہ آئے  
 نویم بعد از آں نادر کتابے

شود تا زرد، چیتھر دگر بار

وہ دگر مسیحا یحیم ہر بار

قلعہ نے یہ شہر دو مہینے میں فتح کی تھی:

غرض در ہفت با در ہفت ہفت

دہم ایں نو روز بے مایہ قلعہ

قلعہ نے یہ کلب غالب اور ان کے چھٹی ہاتھوں کی غصے کے نام معنوں کی

تھی:

دشمن ہر چہ پہنچے ہر یک

دگر از چشم حق میں دید، ہر یک

خصوصاً میرزاے تختہ زارے

بہن طبع، گل رنگیں اداس

نیرنگانِ خن را طرف شیرے

است یعنی ہر میدان دلیرے

قصاک، زو چہاں کش دید باہ

مکل از باغِ غزلہا چہ باہ

رہای، آن کہ شورش چار سو بہت

دگر بار نہ داری، دوزخ بہت

پہرس، از قلعہ اش، گرد نہاں قطع

اگر گویم، بہشت آمد، ہر آن قطع

ز جو آن، تلہوی را بگر خوی

بہ فضل است احمد خاک دلوں

دگر اعداد اغلاش، کہ گوید

تاں داند کہ در راہش چہ چاہ

بود تا میرزا غالب ز من شاد  
 غراب من سر اسر باشد آزاد  
 فدائے میرزا غالب دل و جان  
 گدائے میرزا غالب دل و جان  
 چه غالب ہم نوائے قیصر و جم  
 چه غالب میرزائے قیصر و جم  
 چه اہل لاریں غالب، غالب ما  
 چه از عربی و طالب، غالب ما  
 دورے از ذریعہ قوراں، چشم بد دور  
 مگو از سایہ کاغذ سر بر نور  
 دگر از بند گشتن، زودیای مست  
 گواہ گفت، از سر تا پ ماں مست  
 بود هر روز او آفتاب  
 در دل را خواہد ام روشن کتاب  
 اگر صد دفتر از مدح نگارم  
 یکے باشد، یکے از صد ہزارم  
 الٰہی بر سر من سایہ اش باد  
 ز ہر پاسہ فزوں تر پاسہ اہل باد  
 بماند تا ابد باقر علی خاں  
 کہ از پیران او پیرست خوش آں  
 کند عمر غمر، حق روزی او  
 بود با خیر، خیر اندوزی او  
 چہاں در شکر گویاںش در آیم



کہا از عہد شورش بر آیم  
 باہر غائبیات جناب مرتضیٰ حسین داخل کتبوی لکھتے ہیں کہ ”تخصیصی گھستاں“  
 پہلی مرتبہ مطبع لؤل کشور کان پور سے ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی تھی۔<sup>۵۴</sup> جناب مالک  
 رام صاحب اس بارے میں خاموش ہیں۔ دراصل ”تخصیصی گھستاں“ کا مطبوعہ نسخہ ناپید  
 ہے۔ اس لیے اس کے طبع اول کے بارے میں لوگ غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے ہیں۔  
 ہماری اطلاع کے مطابق کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۷۳ء (۱۸۵۷ء) میں شائع ہوا تھا۔  
 اس کی تاریخ میرزا ماسم علی تہر نے یہی تھی۔<sup>۵۵</sup>

اس نسخہ کہ بہ از گل و رہاں آہ  
 بلبل از شوق او غزل خواں آہ  
 شد طبع و توشیح سال چارمشت تہر  
 ”گھسٹہ لائق از گھستاں آہ“  
 ۱ ۲ ۳ ۴

ہمارے بیان کی تائید مرزا غالب سے بھی ہوتی ہے۔ وہ ۳ جنوری ۱۸۵۹ء  
 کے خط میں تقی کے خط میں لکھتے ہیں:

میں نے کئی جلد مرزا تقی کے دیوان اور کئی نئے اشعار گھستاں  
 کے ان (امید سگ) کی خواہش کے بموجب کوئی پاری ہے، یعنی  
 میں اس کے پاس بھیج دیے۔ یقین ہے وہ ایمان کو ارسال کرے  
 گا۔<sup>۵۶</sup>

تقی قادری کے شاعر تھے۔ بقول مولف ”صبح کشن“ ”تقی عالی خاندان،  
 غزل کے دیبا اور حلائی مطابقت میں سرگرم رہتے تھے۔ بہت بڑے گوتے، قادری میں ان  
 کے پانچ دوایں اور ہر دوایں میں تقریباً ستر ہزار شعر ہیں۔ تقی کے دیوان جہم کا ذکر  
 کسی اور نے نہیں کیا۔

تقی قادری کے مسلم اثبوت استوار تھے۔ وہ بڑے زور نویس، بے حد

خوش فہم اور اپنی قاری پر نازیں تھیں۔ ایک ایک نشست میں سو شعر کہہ ڈالتے اور ایک ایک زمین میں چار شعر لکھتا تکمیل تھا۔ کبھی جلال امیر کا جواب لکھتے پر آئے تو دیوان چار کیا۔ نظیری، تقیم، ظہوری، غرض ہر شاعر کی طرح میں کہا اور خوب کہا۔ غالب ان کی بسیار نویسی سے گھبراتے تھے۔ مگر باز برادری میں کی نہیں کرتے تھے۔ جوانی کے شاگرد اور برابر کی عمر کے دوست تھے۔ وہ غالب کے بہت ہی چہیتے اور ہر دلعزیز شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ غالب دُور محبت سے انھیں اپنے فردوس اور ان کے شاہکار فکر کو اپنے معنوی پوتے سمجھتے تھے۔<sup>۸۵۱</sup> باب ان کا دیوان اول شائع ہوا تو انھوں نے آگرے سے غالب کو اطلاع دی۔ غالب اس کی سعادت سے مسرور ہوئے اور ۱۷ مارچ نومبر ۱۷۵۰ء کے خط میں تقی محمد کے نام اپنے تاثرات یوں درج کیے:

دیوان کا چھپ کر شائع ہونا ہمیں اور حسیں مبارک ہو۔ حسیں پاد  
ہوگا کہ میں نے تمہارا علمی دیوان دیکھ کر کہا تھا کہ میرزا عبدالقادر  
بیدل نے اپنا دیوان غزلیات از اول تا آخر اس طرح مرتب کیا  
ہے کہ ہر زمین میں دو غزلیں کہی ہیں اور ان دونوں غزلوں کے  
درمیان ایک مختلف زمین۔ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم نے یہی ترکیب  
رہی ہے جیسا کہ میری خواہش تھی۔ اس سے تمہارے کلام کی رونق  
بڑھی اور میری مسرت میں اضافہ ہوا۔<sup>۸۵۲</sup>

تقی محمد کا کلام نایاب ہوتا جا رہا ہے۔ ان کا دیوان اول، سوم اور چہارم مجھے  
درستاب نہ ہو سکے۔ فقید دیوان دوم مکتوبہ ۱۸۵۷ء کا حصہ اور مکمل نسخہ کتب خانہ مجلس  
نصائی (عمود) لکھنؤ میں موجود ہے جہاں کہ یہ نسخہ بار بار موجود اور لوگوں کی نظر سے پوشیدہ  
ہے۔ اس سے غالب کی شاگردی کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ تقی محمد نے ۱۳  
سال کی عمر میں ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۳ء) میں قاری میں شعر گوئی کا آغاز کیا تھا۔

دیوان دوم ۱۲۷۴ھ<sup>۹۵۲</sup> (۱۸۵۵ء) میں تقی محمد نے ترتیب دیا تھا اس وقت ان  
کی عمر ۵۸ سال کی تھی۔ اس حساب سے ان کی ولادت ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۹ء) میں ہوئی تھی



## دیوانِ تقی

از تصنیفات جامعہ اشعار و محترفات علیٰ خسرو اکرم  
شیریں بیانی، جلیلی گلشن شیدا، ربانی گل بد بوستان  
حسن مقال کہ ہر گلستان حال نال غشی ہر کوہاں  
اختصاص بہ تقی

۱۲۷۳ ہجری ۱۸۵۷ء

در مطلع کوہ نور لاہور ہا ہخام غشی ہر سنگہ ماے مہتمم طبع آراست  
پہلی نزل کا مطلع و مقطع درج ذیل ہیں۔  
مطلع:

یکوڑ غوطہ ہا زد ہر کہ احمد غول تھیدہ ایں جا  
محبت کر بااے ہست باشد آں شہیدہ ایں جا  
مقطع:

اگر صورت ذکر معنی ہاں بارخ نواں دیدہ  
نہ رنگ دیدہ ایں جا تقی نے پورے شہیدہ ایں جا  
دیوان کی آخری نزل ص ۵۱ میں ۱۱ شعر میں درج ہے، ذیل مطلع و مقطع  
درج کیے جاتے ہیں:  
مطلع:

کھتم آخر من و مرگ اے تو الزامِ دگرے  
گفت آدے نواں دست بجاں دگرے  
مقطع:

کہاں کہ مہار و فلانے باشد  
در فلان من مسکین و فحان دگرے



نرمالیاں کے بعد دیہاں میں دیگر اصناف، قطعات، رباعیات اور نوسے ہیں۔ خاتمہ (ص ۵۹۳) کے تحت نو شعر درج کیے گئے۔ یہ اشعار اہم میں اس لیے ذیل ہیں، درج کیے جاتے ہیں:

کہ و مہ جملہ ما را تقی خواند  
ز مای تا چہ مہ زہی نام آگاہ  
باشد چہ کسی از تارہ گوہاں  
کہ بود تقی را اندر دلی رہا  
بہر بخت و بہت اندر خن شد  
کتوں امید کاغذ مرگ ناگاہ  
نقد گاہے کہ گردیم از پہ مال  
نقد گاہے کہ میریم از پہ جاہ  
نہ دستے حاجت در قش و شور  
نہ پائے احتیاجے بر در شاہ  
چہ چری باز حال آں دو دیہاں  
کہ ما شکیم با صد تالہ و آہ  
کچے در ”مسعد الخیار“ شد طبع  
دوم در ”کوہ نور“ اسے پار دل خواہ  
دعا آتوں ہمیں کامی ہر دو را فیض  
وہ از فضل عام غرض، قلہ  
سہ طبع دوم دیہاں ہمیں بس  
”چہ عالی نسخہ ما طبع شد دوا“

۱۸۵۵ء

صفحہ ۳ میں بھی سال طبع ۱۲۷۲ھ ہی درج ہوا ہے۔ جیسا کہ ان اشعار سے

عیاں ہے:

دیکھ ہاشی کو لیکن دیوانہ اور گردیدہ طبع  
 خوش الزمی اور "اسدالاشعار" اے صاحب شعور  
 گویم اور پری تو سال طبع ہیں دیوانہ دہن  
"طبع ہیں دیوانہ ہر کوئیال شدہ کو کو نور"

قلعہ کے چھوٹے بچے پختہ کا انتقال ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ء) میں ہوا۔ انھوں نے  
 ان کی وفات پر غصہ کا مرثیہ "نور اللہ پختہ نگہ ہر فرد قلیہ مظلوم" ۲۲۲ شعر میں  
 لکھا۔ آخری شعر سے تاریخ کا سال ۱۲۷۲ھ پھری نکلا ہے۔

تاریخ کس پھر کی کہ در خود نام کوں  
 پختہ آہ شد ز جہاں چوں زیم کوں  
 مرثیے کے ابتدائی چند شعر درج کیے جاتے ہیں:

خواہم دگر ز خود تکلم برآمدن  
 یا چشم غولفتاں بجنب محشر آمدن  
 خواہم دگر ز برگ تنہا ہنر و شط  
 بر دوش نیکی بدر داور آمدن  
 خواہم دگر غلاں لب و خاک رہ بر  
 از ہر چہ شد نصیب بگلشن در آمدن  
 خواہم دگر بجنب نومیدی کہ بہت  
 بیرون ز خانہ آمدن و محشر آمدن  
 خواہم دگر بہ بادی وحشت کہ بہت  
 یکبارہ نگاہ از ہر ہر د آمدن  
 خواہم دگر دم ز میان و دم قرار

کاشی روزگار تلخ نداد سر آمان  
خواہم دگر فساد شدن زیری جهان و باز  
احباب را چو خواب بچشم اند آمان  
خواہم دگر ز شوق سجدیدن بپاک و غوں  
نیش از گلوے غولش چو صیہر آمان  
خواہم دگر ہاں غم دل کہ نرد و نرد  
تا کے من و بہاں ز غم دلبر آمان  
خواہم دگر بر آمان از خود کہ دور رفت  
نامکن است از آنکہ دگر در بر آمان

صفحہ ۵۳ سے ۵۴ تک ہائے لال رنگہ <sup>۱۵۱</sup> کا پُرودہ مرشد بہ خوان "نوحہ در انتقال جانی ہاگی لال رنگہ شخص وکیل راجا بھرت پور" در ہے۔ اس میں اے شعر ہیں۔  
ذیل میں اس کے آخری چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔ آخری شعر کے آخری مصرع  
میں رنگہ کا سال وفات ۱۲۷۲ ہجری (۱۸۵۵ء) موجود ہے:

کاشکے ایہ بشر بشر بدوے  
حس بر حس و عمر درگز است  
او ہاں باطنی بلب برخاست  
گرچہ گفتہ راہ پُرخطر است  
صبر دیدی چہ گرم رفت اے دل  
کبر خود کن کہ عاقبت سفر است  
لعل ایہ نوحہ ہی از رنگہ جاں  
مصرعے کہ اے است بیشتر است  
درد و غم غوں کہوچہ ام گرید  
ہاں و حسرت پنکاز نام و در است



لب دعا گوے تارے دگر  
 دیدہ مشغول کرے دگر سے  
 کفعم ایک کہ تار تار دست  
 باز گویم کہ لوح لوح مر سے  
 تا چہ سائل من و نہاں زنی  
 ”مردان رتہ زد بجاں زنی“  
 ۱ ۲ ۳ ۴

اس کے بعد قطعات ہیں۔ صفحہ ۵۵۷ میں نئی بخش حقیر اکبر آبادی سرشت دار  
 فرج داری علی گڑھ کے بارے میں دو قطعات ہیں۔ ایک قطعہ درج کیا جاتا ہے:

چند میرم کہ کن جہد و شرافتم مطلب  
 چند گویم کہ بزدل جام و مرا خورہ کیر  
 قسم ایں مایہ دگر یہ چہ نصستی برم آنے  
 دور ایں خورہ غشی بی غشی حقیر  
 حاشے میں حقیر کا نام اور مجدد درج کیا گیا ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ زیر نظر دیوان کے آخر میں دیوان کے آخر میں ص ۳  
 سے ص ۶ تک قلم لے مطبع کوہ نور لاہور، اپنے دیوان دوم (مطبوعہ ۱۸۵۵ء) کے طائر  
 مرزا غالب اور ان کے گمزد کی تقریب میں ۶۶ شعر کی ایک مثنوی بعنوان ”اشعار تعریب  
 مطبع و دیوان، بلور مثنوی“ شامل کی ہے۔ مثنوی قلم اور غالب کے تعلقات کے بارے  
 میں بہت اہم اور مفید ہے، اس لیے اس کا انتخاب ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

بدہ ساقی آں ہارہ مقید  
 کہ حاصل کسم سرخوشی تا ازو  
 در آں سرخوشی تا دل آید بشور  
 نوید صفات نو از کوہ نور

بدوں آہن زد مراد از کب  
 کہ ہر سو در آگندہ شود و شغب  
 غلغلیں ز مطیع ز دیوان سپہ  
 ہنو ہر چہ گوید دل نکند دس  
 زبے مطیع و کتا کوہ نور  
 بہاں بندہ اش صد غلطی طور  
 ز سکش دل سبک پاریں دو نیم  
 صفایں سائر ولے خود جہیم  
 چہ لاہور و ہر چار سو شہرین  
 چہ ارژنگ بر ہر زبان محفل  
 کا چو اہی مطیع نامور  
 دگر مطیع قش پانچ نظر  
 کا ناز ہے جا عزف ما پے قد  
 کا اردو اہی جا صدف ہا گہر  
 کا کاند از ہمدہ چشم حور  
 کا چشم پے از کنوئیں دور  
 کا از شب حیرہ باشد عمار  
 کا ز اہلی خود فلک ایف دار  
 کا ریش ہست کشمیری  
 کا ہر رقم راست زنجیری  
 غنن ما نوید سے کہ دیوان نو  
 چہ دیوان نو، غل گشتان نو  
 اگر پستی آں ما چہ بدست نام

دگر غیر دیوان تقی کدھام  
 بود گفتے تازه اندر نظر  
 قناتنیاں را بہار دگر  
 بوسہ رخ و زلف اگر شعر با ست  
 گل و سنبل اندر نظر چاہیا ست  
 بہر حال، خون تقی بہار خود  
 ز دیوان ایمانیاں بہرہ بود  
 چہ ایمانیاں نام آں ہا عشق  
 کہ بروند از جملہ عالم گرد  
 غمخیزی کہ باشد غمخیز عیاں  
 عیاں خود عیاں و نہاں خود نہاں  
 نظیری کہ او خود نظیر خود است  
 شامے غمخیز در ضمیر خود است  
 سخن چہ حرفی کہ چوں او کہے  
 نہ بچہ سخن گو خورد خون بے  
 دگر کہے در طالب آملی  
 کہیں سر طالب آملی  
 اسیر آنکہ بود است مرزا جلال  
 جلال کمالی ہوں از خیال  
 حرفی آں عشق کتب جہاں  
 کہ عالی و باغیش نبود نہاں  
 بحر حقیقی و وحشی مستقیم  
 دگر چہ غمخیز کہ دانی تو ہم

چہ حاجت کہ آدم بلب نام شاں  
 ہے بیش تا حشر وہ جام شاں  
 ازین جملہ برتر کیے اہل دل  
 غوش آزاد سروے سخن مشتعل  
 اسد نام غالبِ بخش ہی  
 ر آدم دلپا نہ غافل دی  
 لقب میرزا نوشہ او را وگر  
 داری نام وہ دہر مشہور تر  
 بود مرقدِ نقت از بہت سال  
 نہ رفت از دل و دیدہ وہ بچہ حال  
 رقم ہر چہ زو ازل او را نمود  
 از اس پس پاہل جہاں وا نمود  
 صفاتِ فزوں از بیان است و بس  
 نہ من صد چمن ہے زبان است و بس  
 سخنِ مختصر ایں کہ چوں نقت یافت  
 تاجیں راہ و دیال ایں شہادت  
 وگر کرد محنت بمل و بچ سال  
 بہ تحصیل ایں نے بہ تحصیل مال  
 شب و روز در کج خلوت مقیم  
 نہ فکر زو او را نہ پردائے بیم  
 پس ایں جا سے فکر پایہ نمود  
 کہ حرد تاجیں محنت آخر چہ بود  
 ہمیں زی نقت و ترکیبِ غوش

بہ حسین و عظیم درجہ خوش  
 دگر آں فصاحت دگر آں بلاغ  
 کہ خوانندہ را دل شود باغ باغ  
 نہ ایں گشتی از لاف باشد ہے  
 قواں دید دیوانہ او ما دے  
 بود ہر غزل سر غزل و ہمدیاں  
 چہ ہارنگی غزل و دگر نہاں  
 دگر ایں عظام کہا بودہ است  
 ہر جا ہے نثر با بودہ است

مرزا تقی دیوانہ دوم کی اشاعت سے بھی سال قبل پہلی مرتبہ اس وقت لکھنؤ  
 گئے تھے جب کہ مثنوی نول کشور مطبع کو نور لاہور سے وابستہ ہوکر لاہور میں طبع ہوئے۔  
 قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام لکھنؤ کے دوران ہی تقی نے ان سے دیوانہ دوم کی  
 اشاعت کے لیے کہا تھا۔ تقی کے قیام لکھنؤ کا ذکر غالب نے بھی اپنے خط مؤرخہ ۱۹  
 فروری ۱۸۵۲ء میں تقی کے نام ان الفاظ میں کیا ہے:

آپ کا وہ خط، جو آپ نے کلن پور سے لکھا تھا، پہنچا۔  
 بابو صاحب (جانی ہانگے لال رند) کے سیر و سفر کا حال اور آپ کا  
 لکھنؤ جانا اور وہاں کے شعرا سے ملنا، سب معلوم ہوا۔<sup>۲۵</sup>

تقی دوسری مرتبہ ۱۸۶۵ء کے آغاز میں لکھنؤ گئے تھے۔ اس وقت معروف مثنوی  
 نول کشور کے مہمان رہے۔ غالب انہیں ۱۲ فروری ۱۸۶۵ء کے خط میں لکھتے ہیں:  
 مثنوی صاحب! سعادت و اقبال نکلاں مثنوی ہر گویاں تقی سزاوارتہ  
 تعالیٰ غالب کی دعا سے دردِ بیثباتہ قبول کریں۔ ہم آپ کو سکھو آجاں،  
 قانون گوہوں کے بچنے میں کچھ ہوئے ہیں اور آپ لکھنؤ راہا  
 ہاں سکھ کی حوالی مطبع ”ادبہ اخبار“ میں بیٹھے ہوئے ہمارا حق

لکھنؤ کا پی ر ہے ہیں نور فنی فولکلور صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ بھلا فنی صاحب تو میرا سلام کہتا۔ آج تکشنہ ہے۔ اخبار ("اردو اخبار") کا تقارن ابھی تک نہیں پہنچا۔ ہر پنجے کو پنجشنبہ حد مجھے کو پہنچتا تھا۔ ۱۳۵۰

اس وقت میرے پاس "اردو اخبار" کے سیکڑوں شمارے (جنوری ۱۸۶۰ء تا جون ۱۸۷۵ء) موجود ہیں۔ ان میں سے اکثر شمارے ایسے ہیں جو اردو ادب کے لیے انتہائی اہم اور مفید ہیں۔ محدود پڑچوں میں غالب، فنی ہرگوپال تقی اور میاں داد خاں سیاح وغیرہ کے بارے میں ایسی معلومات ہیں جو دنیا سے اردو کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں۔ ذیل میں تقی کے بارے میں پہلی مرتبہ "اردو اخبار" سے چند اہم اقتباسات درج کیے جاتے ہیں:

"اردو اخبار"، نمبر ۷، جلد ۷، صفحہ ۱۱۵، تاریخ ۱۳ فروری ۱۸۶۵ء، مطابق ۷ مار رمضان ۱۲۸۱ھ، روز شنبہ  
 "ہدیہ اہل حق" (۸۶ شعر)

"ان دنوں شاعر نازک خیال، مدیر شیریں مقال، شیر پیچہ سنخوری، نور بخشا، معنی پروری، صاحب مضامین برجستہ، امینی، فنی ہرگوپال صاحب تقی سکھد آبادی، شاکر مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی۔ انکافات حسہ سے رونق المرد مطبع پڑا ہیں۔ غنی صاحب موصوف نے ایک قصیدہ جناب فیض مآب خداوند نعمت ولی جناب فنی فولکلور صاحب کی مدح میں موزوں فرمایا۔ دینی شعر کو آسان بنایا۔ ہم اس کو تقریباً مطبع ناظرین کے لیے درج اخبار کرتے ہیں۔ ہدیہ سنخوری روزگار کرتے ہیں:

دلہ بر دو رضا بحر افاق داد  
 خوش آن کہ آہنم بر دو دغاں داد  
 اگر دل جست بیش، اندوہ بخشید  
 و گر من غراہم مغر، استخوان داد

روم پر ساحلی بیچوں لطیف  
 قویم دیدہ از آب مرواں داد  
 دلم از غولیش رفتن بسکه ی خواست  
 بکولانش مرواں از کف صفاں داد  
 مرا از دوط پر ساحل رسانید  
 جیب دوط میاں را پا کراں داد  
 قول دیگر کشور آمد وریں بحر  
 و زریں بحر کمر پاس کراں داد  
 چه غیب والدش لازم که پودش  
 چه رفتی پا که اندر دوداں داد  
 شدم مہمان او و خلق گفتند  
 سلیمانی چه مہماں میریاں داد  
 مرا مذاحل از روز ازل کرد  
 بکام آنکہ از رحمت رہاں داد  
 بجای فرش عقد کس کیا عرش  
 زمین ی چشم بودیم آسماں داد  
 جیب دولت مرا حق داد یعنی  
 چه از صد قدرداں یک قدرداں داد  
 چه کفکش آسماں آب بقا ریخت  
 چه طعش طعش عمر جاوداں داد  
 و تر آورد طبع ما سوسے نعم  
 گلستان بند و ما را پوچاں داد  
 چه والا شان و والا ہوا گردش

چہ عالی طبع و عالی خاندان داد  
و گر این ہم ناپاک گفت و شنود  
کہ تقدی را چہا شاہ جہاں داد  
الہی و صحت غصے ی نوام  
کس احسان کان بے کراں داد  
حیات خطر انا زیں قصیدہ  
بس او را تقدہ مجوز بیاں داد  
تقدہ ہر بخ

مقدم فیض مستلزم جناب مفتی صاحب الفصح زماں، الملیج جہاں، عالم ہے عدیل۔  
شاعر لاجپیل شب سوار سخن کے باوجود ہفتہ جناب مفتی ہر کوپال تقدہ جن کو فرماں روا سے  
مکرمہ مرشد خسروی حضرت مرزا اسماعیل خاں غالب دہلوی جلیقہ مرزا مصدقہ القاب  
فرماتے ہیں، سخن سچ اسی بات سے شان مرزائی سمجھ جاتے ہیں۔ طبع داد صاحب ذہن  
داد مفتی کا لکھا پر شاد موجد:

تقدہ آمل زباں طبع شہستان ہند  
طبع پندور را ساختہ پندور تر  
خامہ موجد دو از سال میماں  
”از آمدن تقدہ شد گری بزم ہنر“  
۵ ۶ ۸ ۱ ۲ ۳ ۴

ذیل کے بارے میں ایک مضمون مفتی ذکخور نے تقدہ پر لکھا ہے:

”ادبہ اخبار“، مؤرخہ ہجری ۱۲۹۹

**مفتی ہر کوپال تقدہ سکندر آبادی**

آشنائے مطامیر، بیگانہ نگاہ زمانہ اسچہ مصر کے سہان، فردوسی



دوران، نہایت نازک خیال، مٹھی ہر گپال، وہ ہر خانی مولانا  
 غالب، مرزا تقی جن کے ذکرِ خیر سے ہند کو فخر و ناز ہے۔ الحق  
 عجب چادر طراز ہے۔ زبان فارسی کے نظم، فصیح و بلیغ، صاحب  
 تصنیف شست ہزار شعر جو ایک سے ایک بڑھا ہوا، ہر مصرع  
 میں رنگ اہل زبان کا بھرا ہوا۔ جس نے ان کے دیوان کو دیکھا،  
 کلام نظیری و محمودی کا مزہ ملا۔ عرقی و تقی کا کلام پایا۔ کیا کیا  
 محاوراتِ فرس کا لطف دکھایا۔ پانچو ہائے بخشین کو صاف کر کے  
 ایک اندازِ سخن کا نیا پایا۔ ہر شاعرِ اعجاز پر داز کو پسند ہوا۔ اس شخص  
 کی ذہنی سعادت کہ جس کو آپ کی ملازمت حاصل ہو۔ اگر  
 چندے صحبت رہے، فنی شعر میں کامل ہو۔ ایسے صاحبِ مذاق  
 کا بے کو ہوتے ہیں۔ ماشاء اللہ! چشم بدور، محمود زمانہ ہیں۔

دیوانِ ازل موصوف کا آگرے میں طبع ہوا۔ دوسرا دیوان ہاتھام  
 خاکسار، مطبع کوہ نور لاہور میں اختتام کو پہنچا۔ حضراتِ اہل  
 زبان یعنی شیرازی اور گیلانی آپ کے کلامِ نثر و نظم سے بے  
 وجدانی اٹھاتے ہیں۔ ہند میں آج کے دن آپ کے تلمذ سے  
 علامہ دوران، فیرتہ امروہی، رحمان نواب مرزا اسد اللہ خان  
 بہادر، کہ آپ کے استاد ہیں، غر کرتے ہیں۔ اللہ اللہ کیا وقار  
 ہے کہ استاد کو خود افکار ہے۔ شغوی میں طرزِ لائق، قصائد و طزل  
 میں عرقی سے بھی بڑھ کر صاحبِ کمال ہے۔ بے مثال ہے۔  
 حاجتِ بیاں کی کہاں۔ بیاں ماچے بیاں، سبحان اللہ، کیا کلام شعرا  
 افزا ہے۔ مضامین عالی سے دشمنِ شعر کو آسماں کیا ہے۔ ہم  
 مصرعوں کا کافیہ نگ ہے۔ طبعِ رنگیں میں کیا شروع رنگ ہے۔ ان  
 دنوں دماغِ مطبع بڑا کا اوجِ فلک پر پہنچا۔ کچھ دامنِ دو میٹے سے

جناب ممدوح کی روایتِ افروزی سے مطلع کا طالع بیدار ہے۔  
 میں جملہ تصانیف جناب موصوف کے عشوی مستطیلاں کہ قلم  
 از میں ہر خط میں طبع ہوئی تھی۔ اربابِ ذائق آپ کی چاشنی کلام  
 سے حلاۃ ہو کر قہرِ نکر کی طرح دست بدست لے گئے۔ اس  
 مطلع میں بھر طبع ہوئی ہے۔ احبابِ والا جناب سے جن کو منظور  
 ہو، مطلعِ خاکسار سے منگا لیں، وارِ سخن دیں۔ طرزِ کلام اس عشوی  
 کا ایضاً طرزِ سعدی الحق لائق دید ہے۔ وہی بندش، وہی وزن،  
 وہی ترکیب ہے۔ اَلہم زود، طبیعتِ خداوار ہے۔ آپ کے دم  
 سے ملکِ شعر و سخن آباد ہے۔ عشویِ مذکور میں حکایاتِ عجیب و  
 غریب، زہاں شستہ و رفته، محاورات و روزمرہ ہم پہلوئے فصاحت  
 یوسفیانِ سعدی مشہور ہے۔ اس طرز میں ہر شاعرِ معترف بجز و قصور  
 ہے۔ لیکن جو لوگ تک جوش اس مائتہ فصاحت کے ہیں ان  
 میں استحقاقِ داد ہے۔ اگر نہ دیں، بیدا ہے۔ سوائے دیوانِ ہذا  
 اور اس عشوی کے دیگر تصانیف بھی مثلی تفسیمیں جملہ اشعارِ فارسی  
 گستاخ از منقبِ خداے راجحہ است باغیر حضرت موصوفِ مطلع  
 علق میں طبع ہوئی ہیں۔ قافیہ سخاوتِ سخن فہم لے سہو جاں دے کر  
 مثلی ہفت سول لی ہیں۔ گلاب بے جان میں گویا روحِ تازہ دی  
 ہے۔ فی الحقیقت مسیحا کی ہے:

جہ کہ قصصِ گستاخاں سن چکا

روحِ سعدی نے صدا دی، مرہا

فرض اپنی تصانیفِ کثیرہ سے بہت کچھ یادگار بھونڈا ہے۔ گویا باقعات  
 الصالحات لکھا ہے۔ المختصر جس روز سے تشریف لائے، شعر و سخن کا دماغ نہیں مٹا ہے۔  
 کیا لطیف صبحِ ہر وقت رہتا ہے۔ اَللّٰہُ اَعْلَمُ، یحییٰ قدر و منزلت اس عصر میں حضرت تقی

کے نصیب ہے، دیکھی نہ سنی۔ اخلاق وسیع، فہم نوا، علم و ادب میں یکتا، یگانہ و بیگانہ  
 سب کے آشنا۔ فرض مجھ کو حضرت تقی کی تحریف آوری سے گھر بیٹھے گنگا نصیب ہے۔  
 محتاجتِ ہندی کا کیا شکر ادا ہو کہ ہم بیچارہ ہم نوالہ صاحبِ نصیب ہے۔ اس ذکر ہم بیکاری  
 اور ہم نواگی میں ایک غزل بھی ان کے پہلے دیوان کی، کہ مدت سے مجھے از برحق، نقل  
 محفل کرتا ہوں، ناظرین ملاحظہ فرمائیں، کاواراستہ فرس اور مضامین نو کا لطف اٹھائیں:

شونے کہ کرو چشم مرا با ہم آشنا  
 بیگانہ بودہ است و زلفِ خانم آشنا  
 اسے بدگماں کہ کرو بدنام آشنا  
 جانم بہ درد و درد تو با خانم آشنا  
 درباب یک نفس کہ چہ ی دادم آرزو  
 یاد آر یک زماں کہ منت آم آشنا  
 نیک اخترے ہیں کہ بومیدم دوچار  
 خوش طالعے مگر کہ بہ حرام آشنا  
 او ما جو آشنائے رقیباں ہم آشناست  
 از ہر مصیبت بہ رقیہام آشنا  
 گرم نہ چون خاک مسیحا ترا  
 کردی برگ اے علم بھرم آشنا  
 معانم ہیں کہ ہم تا دیش دلیر  
 تا غیر داند انکے ہرنام آشنا  
 ناکام ہیں کہ تو کام آرزوست  
 ہوا ہم مگر کہ ترا خانم آشنا  
 با کھنم انیس و با ناکام ہیں  
 با حرم ریش و ہرنام آشنا

ساتی پیار نے کہ نہ من تقوٰی ہم سکوں

کاسب مہر غلام و با خانم آشنا

واضح ہو کہ ان دونوں جناب ممدوح نے ایک مثنوی بردارن "مثنوی علی دین"

ایسی لکھی ہے کہ سبحان اللہ۔ ایک ایک لفظ میں اس کے دو دو تین تین پہلو ہیں۔ اس

میں کچھ حضرت یوسف اور برادران حامد یوسف کا سا بیاں ہے۔ الحق جب داستان

ہے۔ حسب حال اس مقام کے، ایک قطعہ خود مرزا تقوٰی کا "در باب حسد" مجھے یاد آیا جو

درج افہار ہے۔ غن فہوں سے راقم افہار تحسین کا خواستگار ہے، و بکا ہوا۔

ہر داور الہی و ازلی

چہ قبول و چہ رد، چہ صاف و چہ تود

یوسفیاں شود اگر ہمہ دہر

اے برادر حسد پیارو تود

جو یہ نکتہ نہایت دلچسپ اور شیریں ہے، بعد طبع ہونے کے جہمات کی

شیرینی ہو جائے گا اور جو طبع مثنوی "مسلمہاں" کہ طبع ہوتی ہے، طبع ہوتا اس کا اس

طبع میں شروع ہوگا۔ تعلیٰ غن کے باب میں لکھتے ہیں:

اے ما کہ بلند داسے نمود

در معرکہ پیچ پایے نمود

غش و قبح کے کہ داسے داور

در معرکہ حیز پایے داور

اور اس نکتے میں یہ حکایت بھی درج ہے:

من بدم و کارداں سراے

در یک لولی جب اداے

دیکر دو سر امرد بجاں سال

کل یں گل چہرہ سرہ تحسین

ہر یک معشوق ما طلبکار  
 تھا چاہل و آفرکار  
 آخر بکرمست کہ چوں شد  
 غوں شد دل، تنگ و نام غوں شد  
 درخواست ازاں سے امرد آگاہ  
 یک امرد دھکب ماہ آگاہ  
 ہو کارے کہ ہم تو دانی  
 تھا گفتنی نمی تو دانی  
 چوں رو قدمے براہ بارے  
 معلوم کہ تو رہزنی بہارے  
 گنہا ہر چہ از گنہاں  
 در دوس قزو چو مستان  
 بیاں لولی کہ دنجہ او بود  
 چو سحر او کہا نگو بود  
 جاست چنان کہ دیہ لیل  
 غنچہ دگر بہ معشوق گل  
 پرستہ کشش کہ نام تو جوست  
 مطلق بہ دماغ تو فرد نیست  
 از من ما فہم کن، دلاں باز  
 یک رہ ز معلوم ہو باز  
 قصہ چہ رہے تو ہی فرامہ  
 شایاں بہ طعنے بگفت رہے

### قطعات فارسی (صفحہ ۱۰۰)

اس خطے ہمارے کرم فرماتے دیرینہ غریب ہے مثال، شاعر  
 پاکمال غنی ہر گویاں صاحب انکس یہ تقوٰی نے چند ملائے تاج  
 وفات مرزا اسد اللہ عاں غالب مرحوم اس دفتر میں ہارث و طبع  
 بیجے۔ اگرچہ قطعات ہذا سابق ازلی اخبارات دیگر میں درج  
 ہو چکے ہیں مگر یہاں ارشاد جناب موصوف بطرز قیو کرہ "نمودہ  
 اخبار" میں بھی چھاپے جاتے ہیں۔

غالب وہ شخص تھا، ہمہ دانا، جس کے فیض سے  
 ہم سے ہزاروں بچے جاں نامور ہوئے  
 فضل و کمال و صدق و وفا اور حسن و عشق  
پھر لفظ، اُس کے مرتے ہی ہے یاد سر ہوئے

### قطعات فارسی

صیغہ اہل عالم غم فراقوں گشت و دیگر درد  
 جزو و دو صد و چھادھری بود و دیگر بیخ  
 دیرالک، غم اللہ ایک و جزو دیگر ہم  
 نظام ازل بود زں بعد، جنگ اسے یار سنی بیخ  
 شخص غالب و از ہر صفا اشعار با خود داشت  
 ہمارے سبب نقادان علم و فن، ہزاروں بیخ  
 شد آں یکا و تاج وفاقوں زد رقم تقوٰی  
 یکے حسرت، دم حرماں، سوم اندو، چہارم رنج  
 یعنی ازل چار تقوٰی ترحم یک درد یکا، کہ بر صیغہ گزیدہ است،

ایضا

خان ہر خان، اسد اللہ چہ کوچہ  
شد شور قیامت بہ زمین و زن، اے دے  
بے دوست دل اسرود خیم دل چہ بکارے  
بے دوست خن مرد، ہر چہ گویم خن، اے دے  
دہ الجمن ہند، ہر ہر کے شیخ  
آں شیخ شد و گشت جی الجمن، اے دے  
من ہم دوم آنکوں کہ دگر ملک خن ما  
کو تازگی اور رخت ز دار کهن، اے دے  
آفاق چمن ہر د چہ گویم کہ چہ ناگاہ  
زاں بلبل خوش لہو جی شد چمن، اے دے  
ہر آگہ ز ہر علم و فن آگہ بہ لہ نصرت  
راہم چہ دگر من خن از علم و فن، اے دے  
تاریخ دے اے تقی بہ سقوط حروف ست  
از مردان قاتل چہ قدر دلہ من، ایہ دلیٹ

ایضا

ہاں ہر گنجی ہاں ہر قاتل  
ز تاریخ خن آگہ کھا کھر چہ  
من تقی یک خار و گویم چہ دگر  
سہ رشتہ "مظہر مرقی" کوچہ

ایہ بلاء تاریخ کہی توہم، قلعہ طوفانی ست، صرف بلاء نوشہ شد

"اے وقامت اسد اللہ خان" = ۱۲۹۵

[”اودھ انجیل“، ۲۶ اکتوبر ۱۸۶۹ء، صفحہ ۱۰۳۲ تا ۱۰۳۹]

انجیل کا یہ شمار نہایت مفید اور غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں تقی نے واقعی غالب کی شاکردی کا حق ادا کیا ہے۔ انھوں نے غالب کی وفات پر ۱۵ بند کا ایک طویل ترجیع بند لکھا جس میں غالب کی سیرت کے علاوہ ان کے کلام کے عکاس بھی بیان کیے ہیں۔ یہ مصرعہ آرد مرثیہ صرف ”گودھ انجیل“ تک ہی محدود رہا اور تقی کے کسی دیوان میں دستیاب نہیں ہے۔ تقی کا کوئی دیوان اب نہیں مل رہا، خال خال ہی کہیں موجود ہوگا۔ ڈیل میں پیدا ترجیع بند درج کیا جاتا ہے تاکہ محفوظ رہ سکے:

## ترجیع بند

### دور ماتم میرزا اسد اللہ خاں صاحب مرحوم

ہیں! چہ شہل ما عزم شد  
اسد اللہ خاں و عالم شد  
نہ شدی کاش! ایک دو قرنہ دگر  
راحم رنج و شادیم غم شد  
آہ از سجد ام بچاہے خاصہ  
انک از دیدہ ام دایم شد  
حال او یوں آں کہ نیکو گشت  
کار ما یوں آں کہ برہم شد  
من چہ کفتم کہ عالم بر گشت  
سہ کسں، آںکے شہم شد  
یک ظف بود آنگہ نام آور



ہم چہ غالب چہ نسل آدم شد  
 گفتی نیست انتہای کلمش  
 یعنی ایی ہیں کہ پنج من غم شد  
 آن خنود دے کہ شد ہے جاں  
 چاں ز جسم غنہاں جاں دم شد  
 چوں نہ خواہد رسید از من و دل  
 نام آرام با اگر دم شد  
 یادم آمد چہ سیر در پیش  
 انگ چاری ز جسم ندیم شد  
 آن قدر کہ دور دل افروز  
 آن قدر تا دم ایی مریم شد  
 چاں بدو نوی شرف محبت  
 دل چہ داغ کھن سکرم شد  
 مرگ نادر ہنوز د چاں گوید  
 بقولم نمی فراہم شد  
 از پیر و چہ چہ ذکر و چہ وقت  
 دل نہ سواب و غم نہ رحم شد  
 ہے کیے کہ دیم چہ ایی در بلا  
 دہر سکرم پیر ارقم شد  
 آدم رسید بہ لب بام  
 لیکن احمد نہ زکات کم شد  
 یادم نیست گویم از جبریل  
 کہ پاکندہ دل فراہم شد  
 با ذکر شخص گوید ایی کہ مرا

دردہ دستان، و دلم، مرہم شد  
 ہر یکے راست ایں سخن بہ لب  
 طیر ہارح الم کہ خرم شد  
 ہر کہ از صبر لاف زد ایں جا  
 خوش ارباب عقل، علوم شد  
 تارح من داغ و خنجر من خاک است  
 تا سخن، ملک ظم، مسلم شد  
 تو بہ گل آمدی و باغ ہم  
 ہمہ در درد غیر مقدم شد  
 داشت اندازہ ہائے پتھوں  
 کو ز اسرار او چہ محرم شد  
 گاہ آئینہ، گاہ جام گرفت  
 کہ سکندر شد و کیے جم شد  
 ساکھان را جزیی نہ نقد بہ لب  
 او نہ شد، از زمانہ حاتم شد  
 علی من و صد چوں من دعا کو را  
 خاطر آشتی، طبع و دہم شد  
 شدہ آغوش چشم، خوں شدہ دل  
 کند گوئی، بپاہ ورم شد  
 در بہ پای چہ شد، چرا ایں نوع  
 نوہ عالم، تمام باقم شد

فخر مرئی و دھک طالب نرد  
 اسدائے خان غالب نرد

اسد اللہ خاں نہ تھا رفت  
 ہریش جان ما، دل ما رفت  
 سخن اسرودہ دل، سخنور مرد  
 معنی آزرودہ، معنی آرا رفت  
 رفت آن جالے چہ من کہ پیر  
 تا شکویم کہ او ز دنیا رفت  
 لعلک پندہور از جوی بگذشت  
 آو پندور تا شریا رفت  
 گرچہ او رفت از جہاں لقا  
 پاو او از دلم نہ اصلا رفت  
 فصل داود ہر گوش، پس مرگ  
 دینی از دہدا چہ دنیا رفت  
 رفت زوشل پیچیدہ المادنی  
 ای کہ گوید کہ او ز ماوی رفت  
 لورنی رشت از چنارو او  
 جالے از چو قشاق رفت  
 من چہ ہستم ازو نکلیں، خبر مل  
 گفت چہ من ہریش اہل رفت  
 درد ہاے مرا دوا او بود  
 جوں نہ میرم، کنوں مسجا رفت  
 در طعن رقی سست جاں ز تم  
 گر نہ اسرودہ رفت، فردا رفت

مکتوم از صبر من کہ هست لقا  
 بمقاسے کہ ذکر عطا رفت  
 وہ چه ایی آدم، چه آں رستم  
 حسرت آمد بہ دل، قضا رفت  
 از در یاس کاں ندانم گشت  
 رستم کو، کہ طاقت از پا رفت  
 تا چه آمد بجان من فردا  
 آں کہ امروز بود یکجا رفت  
 آنچه بر من نہ از طاقت کے  
 چوئی از یی رفت بود، حالا رفت  
 چوں نہ قرباں روم بجا رفت  
 بر من و جان من بجا رفت  
 آنچه یی خواستم نہ گشت نصیب  
 دامن چه یی دانستم، بہ یثما رفت  
 چوئی از چوں مرا نہ کرد ہلاک  
 از من و مرگ، ناجہا رفت  
 بود ہر چند کوہ پا بہ جا  
 نالہ ام چوں شکیہ از جا رفت  
 صبر شد مضطرب، در علم او  
 یا نمی رفت دل ز خود، یا رفت  
 رفت تقدیر و گفت من ناچار  
 بہ تاریکی بمن، تا رفت

قلی ہے او پر گشت دیوانہ  
 چہ قدرہا کجہ و صبرا رفت  
 باز چوں خواہد بوی غریبش مرگ  
 چہ گویم، چہ ہے محال رفت  
 چہا بدلی روانہ کردم خط  
 غیر آمد، حضور والا رفت  
 بود "ماتا کسے کہ با حافظ  
 اندر دی روزہ تاتا رفت  
 معلوم آئیں، طوفان ہاے نامہ  
 چوں حکایت از جام و جانا رفت  
 نفس خود کسب و بر داور  
 بر نہاں ہرگز نہ حاشا رفت  
 دشت از غریبم دم را نبرد  
 گاہ ای جا و گاہ آں جا رفت  
 من نہ معلوم جہاں چلتے شعر  
 باز عرقی و طالب ایجا رفت

لجر عرقی و رجب طالب نرد  
 اسد اللہ خان طالب نرد

۳

اسے کہ با الوردی نرد بود  
 سخن بملہ سر الورد بود  
 بوی آں پیش گو بہ فنی سخن  
 بیشتر آں کہ بود کمتر بود

در سپاسی کلام شیرین  
 تر دہاں آں کہ بود، کوثر بود  
 شوکت خسرواں چہاں نہ بود  
 رجبہ اش بانی خلق، دیگر بود  
 شہرت او بہ ملت چرخ بنور  
 ایں کہ گوید بہ ملت کشور بود  
 لفظی از دے، ہزار معنی داشت  
 حرفی از دے، ہزار دفتر بود  
 از نکای ہم آں کہ نہ دستی  
 بر سر اہل ظلم، افسر بود  
 تا چہ روشن کلام، او کوئی  
 لفظ او ماہ، لفظ آخر بود  
 جوہر او، ہونہ کے معلوم  
 در حقائق ہاد کہ ہم سر بود  
 بہ علی ی خودم قسم صد ہار  
 کز دل و جاں فدائے جہد بود  
 آنچہ ی یافتی نہ خویش نہ داشت  
 دانچہ ی غواتی، منتر بود  
 بود از بس صفا بہ آب و بکس  
 نہ شنیدم کئی، کند بود  
 بر در او ہزار کس سو بود  
 خود و بیک منجم یک در بود  
 چہ خوش ایں گفت کز بہ مجمع عام  
 بخش ہیکہ مدح پور بود

ن

چہ قدم چہ نہ دلاں خن  
اسد اللہ خاں، دلاور بود  
کج کسانے، کہ راہ می رھتہ  
ہر شاں وہ تھا چہ مسطر بود  
تا چہ از کس حسد چہ نظم او ما  
اں قدر قدرت از مقدر بود  
مگر کسے خدو چشش آوردی  
کے گریختہ، دیش تو انگر بود  
کھنہ داشت وہ خن کز دے  
مطو روحانیاں، معطر بود  
مصرع مالی مسطر کرد  
تجلی او را دگر چہ بخور بود  
سعدی طبع او، بزاک قلہ  
ہر چہ ہی گشتہ، جلد گوہر بود  
ہر روحانیاں کھنہ اقرار  
او ز روحانیاں مقرر بود  
کم ز ہمشید کس نہ جانفش  
وہ کشش آں زباں کہ ساغر بود  
از فروغ دجور او ہر دم  
غواں او تا چہا سحر بود  
سید فریب چہ نام ہی آورد  
میلی او کے چہ سید ناصر بود

۵

یعنی آں معنی پلہ کرد  
 سددہ ہم پست و ہم فرور بود  
 آرمودم ہزار ہا ایہ را  
 قوش او کمتر از خوف، زد بود  
 از دگر علم تا چہ حرف او را  
 ہمہ علم الہی ازیر بود  
 الغرض، جو مردیش پہ زبان  
 غیر ازین گفتہ را نہ دیگر بود

فخر مرکی و رجب طالب مرہ  
 اسد اللہ خان غالب مرہ

۶

اسد اللہ خان نامہ انیس  
 فخر ہوشیار نامہ انیس  
 ایہ نہ گویم کہ آں نامہ انیس  
 در حق خلق ہاں نامہ انیس  
 نام آئینہ سار، نہ چوں حیراں  
 طوطی خوش بیاں نامہ انیس  
 رفت بر کوئی سامعین علیہ  
 لب او ذوقاں نامہ انیس  
 یوحنا بود دلی و ہے او  
 رونق یوحنا نامہ انیس



خانمیں را دگر چہ نامہ شرف  
 شرف خانمیں نامہ افسوس  
 عظیم او نامہ جاوہاں فنا  
 طویشتن جاوہاں نامہ افسوس  
 بود جانہ جہاں خود آنکہ دگر  
 کسے در جہاں نامہ افسوس  
 کاروان دگر کہا نامہ  
 بود یک کاروان نامہ افسوس  
 آسمان و چین ستم بر من  
 اثر اعداں لقاں نامہ افسوس  
 دہر را غم گرفت زہر کھیں  
 حکم شادی رواں نامہ افسوس  
 کز چہ پر سیدہ اند و ہم کھنم  
 کہ یکام زباں نامہ افسوس  
 چہ گویم نہ نامہ خوں بہ ہجر  
 چہ گویم فلاں نامہ افسوس  
 بر لب آنکہ سرزنش چہ شنید  
 تا قیامت چہاں نامہ افسوس  
 من بہ خاکش چہ کجورم جہا  
 دل در طوں چہاں نامہ افسوس  
 ہر کہ پرسد چہ صدمت؟ گویم  
 نہ سوسے آسمان نامہ افسوس  
 باز بہ صبر طویشتن دل داشت  
 ہر چہ دل داشتہ آں نامہ افسوس

تا ز دارالکائنات چہ ہے او، ذکر  
 احمدی راہ، اماں تمامہ انہوں  
 داشت صد رہ جہانی از یک جہ  
 دقیقہ دوراں جہاں تمامہ انہوں  
 شاد و غم و لم چنانکہ مانہ  
 خوش از ہی آں چنان تمامہ انہوں  
 بہ یکے رفعت و من یک ہار  
 جانب رفعت و تواں تمامہ انہوں  
 دل من، ہم بہ سید چون مانہ  
 کاں کیوں دو مکاں تمامہ انہوں  
 شفقت و مہر، ہر دو شکت تا  
 مشفق و مہرباں تمامہ انہوں  
 گفت کس آں زماں کہ غالب نرد  
 چچہ دو دے مکاں تمامہ انہوں  
 من زمانیکہ شادی مامم  
 کو دگر آں زماں، تمامہ انہوں  
 تا چہا غول شد و ز دیدہ چکچہ  
 راز ایں دل، نہاں تمامہ انہوں  
 آنکہ پامش بہ ہر کہا شکوی  
 از وجہش نکاں تمامہ انہوں  
 مشق خاکے کہ بر سر افحام  
 احمدی خاک دلاں، تمامہ انہوں  
 بیہماں صد ہزار بر سر خواں  
 یک یک بیہماں تمامہ انہوں

سائل آگے چہ بخود آں دل دوست  
 غیرت بحر و کان لہائے انہوس  
 تا چہ کے تقے بر لب ایں دستان  
 تا کجا بر دباں، لہائے انہوس

فخر مرآئی و رقیب طالب مُرد  
 اسد اللہ خان طالب مُرد

•

یک دل ست و جزو غم، چہ کسم  
 نہ کھد دم مرگ، ہم چہ کسم  
 اے کہ کوئی کہ صبر کن دو سے روز  
 دھمکی ہست یک دو دم چہ کسم  
 فلک و دہر و بخت بہ کھنکھ  
 چہ آزار من بیک چہ کسم  
 چوں نہ سازم بہ تلخ کاسیا  
 غلام کھنکھ بھلہ سم چہ کسم  
 اے کہ کوئی تھور دماغ مرا  
 شرح اعداء غرض کم چہ کسم  
 تا چہ نہ صود نہ بین صود (کھدا)  
 کھدا طالع دھرم چہ کسم  
 گریہ ی غلام کسم ہمہ عمر  
 چوں بہ ہشتم لہائے غم، چہ کسم  
 کھدوم من چوں روز و کھدار  
 کھدار مرا الم چہ کسم

تا بہ کے دل کند لقاں چہ طالع  
 تا کیا من کشم حتم چہ کسم  
 اسلافہ خاں غالب است  
 کمر آنتوں سوے عدم چہ کسم  
 رقم من انچه کردم ایجاد است  
 سو او جزیں رقم چہ کسم  
 جانہا کردم و چہ اوے ما  
 پایم اصلا نہ وہ ہم چہ کسم  
 وہ غمش شرح تا قوتی طویش  
 از کسم چوں کند قلم چہ کسم  
 بود بہ از ارم باد برون  
 کرد بندم باد ارم چہ کسم  
 سجدہ گاہ من آستانش بود  
 سوے عراب پشت قلم چہ کسم  
 آن سفالیں حالہ چوں آنتوں  
 از کش نیست جام جم چہ کسم  
 تا ازو ی شکیم آن کلمات  
 تا شدم ایما زباں امم چہ کسم  
 آن کرا رام بود آنتوں کو  
 نہ کسم گر ز خویش رم چہ کسم  
 آن کہ ہے استہ زندگی ہم چہ  
 خود بہ او ی خود قسم چہ کسم  
 قمر نہ چشم از حرم کم نیست  
 تا بود قمر او حرم چہ کسم

کھلم آنگہ بود رفت آنگوں  
چرخ اگر خنقدم خشم چه کسم  
شاه بودم چه بود او آنگوں  
من فقیرم، خشم خدم چه کسم  
یار آن راجی کہ با او بود  
دہم رنج دم چه دم چه کسم  
ایں ہمہ کرد و باز گوید دہر  
چچ بر آکسے علم چه کسم  
عیف، نرد آنگہ ہر زباں ی کرد  
ہمن آن لطف آن کرم، چه کسم  
خلید با غوم اہل و ر ضط  
بر فقیر مرا قدم، چه کسم  
عظیم من و کنتہ احسا  
ہر عظیم چوں خشم، چه کسم  
ہر دم ی شود فزوں ہے او  
رنج بر رنج و غم چه غم، چه کسم  
خود نظام چه کم، چه ہرزہ دم  
کوش بر باکب زبہ و ہم، چه کسم  
بود ہر عالمی دلم کہ بحر  
شد ہر دیہاگی علم، چه کسم  
نکتہ از درد من مہد آہ  
کہ نہ ہر دم نعل کسم، چه کسم

نور مری و رنگ جالب نرد  
اسدقہ خانی جالب نرد

میرزا غالب آہ، فطرت پہ کہہ  
چل نہ پاشم کفن منی مجھ  
میرزا غالب آہ، زندہ نماند  
چل نہ پاشم من از حیات کفور  
میرزا غالب آہ، قصد عدم  
کرد خود اختیار و من مجھ  
میرزا غالب آہ، اعدا غلہ  
سر خوش و من بنور طالب حور  
میرزا غالب آہ، نزدیک است  
پہ ہزاراں سرور و من تو دور  
میرزا غالب آہ، بے من خاست  
ایمہ قدر چل سرور با محصور  
میرزا غالب آہ، ایمہ چہ نمود  
در پتائیل شکایت است ضرور  
میرزا غالب آہ، منظر فیض  
بود چہاں کزو حضور، ظہور  
میرزا غالب آہ، نمود نہ خود  
با خودم، تا مرا وہاں چہ تصور  
میرزا غالب آہ، داشت چہا  
با سر و شانی فیض اوقی حضور  
میرزا غالب آہ، آں کہ کہے  
کم نہ داشتش من از فقہور

میرزا غالب آہ، آں کہ کنوں  
 خواہش خلق "غالب منظور"  
 میرزا غالب آہ، آں کہ ہونہ  
 مدح خواہان او ناث و ذکور  
 میرزا غالب آہ، آنکہ دلاش  
 نہ نیک جا، ہزار جا نیکہ  
 میرزا غالب آہ، آنکہ نرہ  
 قسم شد جملہ فہم و عقل و شعور  
 میرزا غالب آہ، آں کہ دس  
 ی شیدی فرل بہ دوق ہزار  
 میرزا غالب آہ، آں کو را  
 رام از جان و دل دوش و طیر  
 میرزا غالب آہ، آں عاشق  
 کہ یکے کو کین برش حرور  
 میرزا غالب آہ، در فہم شعر  
 بد چن ہوش عقل و شعور  
 میرزا غالب آہ، ی لہجہ  
 ہر چہ ی بد در دلم مستور  
 میرزا غالب آہ، از نظرم  
 رفت چن دور شد چہ اش مستور  
 میرزا غالب آہ، نرود و بدل  
 شد بہ باقم زمانہ را ہر سود

میرزا غالب آہ۔ ی۔ شکستہ  
 چہ قدر درد پہ نرود ہے مقدور  
 میرزا غالب آہ۔ سوئی بود  
 اعتقاد مراد و دلی طور  
 میرزا غالب آہ۔ آں کہ معلوم  
 سایہ او را و او سراپا نور  
 میرزا غالب آہ۔ چوں کوچہ  
 شد پہ ملک غنیمت جزر نور  
 میرزا غالب آہ۔ نرود و مرا  
 ز آتش غصہ سید رنگ نور  
 میرزا غالب آہ۔ کو کہ مرا ست  
 روز روشن ہم وہ دیگر  
 میرزا غالب آہ۔ کے دانہ  
 کہ چہ از عشق دلم مسرور  
 تقی معلوم ی توں بودن  
 تو چہ ای لکھ ندان مسرور

نور مرقی و رنگ غالب نرود  
 اسد اللہ خان غالب نرود

۷  
 دار چرخ ستم گرم بہار  
 دار از دست ای شکر دار  
 انچہ از فتنہ میرزا غالب  
 بہ من افکار بہ کس نہ قرار



کھتہ زانی دگر کہا آئینوں  
شد ز دہر آں کہ کھتہ پای زاد  
سایہ برداشت از سرم اسے داسے  
آں کہ پانچہ سرد بود آزاد  
او چہ آباد کرد بخت را  
من نہ باطم دلی خراب آباد  
شادیم رفت بہت و کواں نرد  
نام شادائی بہ منی شاد  
کریم آں دم کہ در غمش خود اہ  
نہ تواند بہ بخش من استاد  
نمود سوسے طلعہ دیش عزم رواند  
داد. عمر سرا کسے کہ بہ یاد  
ہیں زمیں سخت و آسہاں دور است  
از کہ جہنم من ایں زباں اہاد  
چہ دعاے ہا کہ میں میرم  
زندگی جملہ کھتہ است و فساد  
آں کہ را بود عقل کل شاگرد  
کھتہ را بود ہیں جہاں استاد  
بہ سر گدش از پے شیراز  
ی زلم جام ہر چہ پانا پار  
سوسے ملکب ہم نہاد قدم  
اسد اللہ خان پاک نہاد  
حسب عالم ہمیں مقام بود  
ایں کہ گنت است چیں ازین استاد

دردِ دل چوں نہ رہ کند اندوہ  
 نہ بیم چوں نہ جاں کند فریاد  
 فخرِ عرقی و رکبِ غالبِ نرود  
 اسد اللہ خانِ غالبِ نرود

۸

میں کہ گویم کہ حالِ دل چوں ہے  
 صبحِ مظلوم و شامِ محزون ہے  
 و چشمِ عرصہ کرد بر من تنگ  
 سر و کلامِ کتوں پہ ہاموں ہے  
 گریہ دیکر چہ رکبِ نینِ ماہ  
 کوئی آفاقِ جملہ کنگوں ہے  
 غیرِ میں کزِ خدائے ہی خواہم  
 کیست آں کو زمرگِ محزون ہے  
 حالِ یک یک چہ با کسے گویم  
 دلِ جدا و تگرِ جدا خوں ہے  
 ہیں عیالِ کلامِ نرود و لے  
 صدِ تنہا پہ سیدِ مدفن ہے  
 اسد اللہ خان نہ آں کہ نرود  
 بچ صاحبِ غرض نہ محزون ہے  
 وحشِ عقل سے مکتبِ غالب  
 عقلِ کل ہم یہاں چہ مفلون ہے  
 سرخوش او رشتہ و ز رشتہ او  
 جامِ کامِ زمانہ کاٹوں ہے

بعد مرگ سے ۔ از بچائش  
حائل آن کسی کہ بود بخون است  
او کسی ہے کہاں چہ بود آنکوں  
حائل ما نیکیاں و مکرگوں است  
کنہ از صدق اعتقاد امروز  
ہر کہ فرشتہ بیایں فرجوں است  
از حد افزوں چہ بود در ہر علم  
صحتش از عظام افزوں است  
من نہ طوایم صدور ہے او ماند  
ایہا چہ انسانہ و چہ انسون است

نغمہ مرگ و رنج طالب نرد  
ابداً خان طالب نرد

چند گویم کہ کوہ و کافہ ایہا ہاست  
یعنی اندوہام از حد است زیاد  
بود زہی چینی طرہ حافظ ام  
غیر لہجہاں سکوں نہ دارم یاد  
آن کہ گفتی فراغت نہ کنم  
رفت و یک رفتہ نیز فرستاد  
کام دل نرد بر سر تعشیش  
ی روم نوہ ی کنم بنیاد  
ی کنم رنج و میرم از طویش  
ی دلم داد و ی کنم فریاد  
کس چہاں ہاں بود ازہی ہر دو

دور سفاک و آسماں ہے داد  
چلن بخود جہر آسماں ظہم  
یادم آمد اردو چہ لطف و داد  
کاش من ہم بہ لو شباب رسم  
عیسیت پرہم غیر ازیں اوراد  
فنی انجام آں ہر کس چہ شود  
آہ من سرسراست و جسم رساد  
آں سے چادہ چہ گشت تمام  
سہ عدد بود زائد از ہفتاد  
من چہ سے خانہا بجا آدم  
رہنم کردہ بود ہر چہ رشاد  
یعنی آں سائیں چہ کف حافظ  
مصعب غوثین چہ قالب داد  
فی رسد گر چیں دعا چہ کسم  
اسد اللہ خان چہ غلہ رساد  
نومرہی غن جہانست جہوز  
چہ سطر بود فی درد دلااد

عز مرقی و دھک قالب نرد  
اسد اللہ خان قالب نرد

۱۰

بجز دیکر مددنی دل چہ بود  
درد دل ہم شمار دردن ست  
کڑھ گریہ را کسم چہ جہاں  
خود توں دید دیدہ بنگون ست

دیدہ باغید قش ازیں کے بود  
 عالم اخر چہاں کہ اکون ست  
 نصیم آسائیم چہ بود ہاں  
 ایں ہم لطف نصیم گردوں ست  
 ایں کہ بخت زبست را بہ من  
 طرفہ مضون کذب مقلون ست  
 آن حزنیم کہ تا ابہ گویم  
 روزیم حادہ اص القون ست  
 چہاں فیروز مردم دانا  
 لطف گردوں بہ مردم دون ست  
 ہر کش دید ہا چہاں حکمت  
 مکت ہے شہ ایں غلطوں ست  
 قوانیں خود گواہ ایں سخن اند  
 شہرت او د ہند تا قون ست  
 بزمین آن کہ داشت از اکوں  
 مکتش ہم سکوں و اکوں ست  
 بود غالب ہاں عیہ کمال  
 سخن کی لطف وز ککوں ست  
 زبست است آنکہ بہ نردان او  
 چہ قدر ہا و غریب مقلون ست  
 جا چہ گویم کہ چہاں وہ او را  
 بہ چہاں قاصدے کہ ہے چہاں ست

لفظ و معنی نہ ہیں یہ پیش  
 وہ ہم غالب ہیں چہ مضمون ست  
 ہر خط ی ستودش زہی بیش  
 نقد بر لب ہی ہم اکنون ست  
 بحر عربی و رجب ۱۲ غالب فرد  
 اسد اللہ خان غالب فرد

مہم و از اجل شکایت ہ  
 دگر از زمینِ عداست ہ  
 آہ زہی رنج ہ و محنت ہ  
 دوا ازہی نقد ہ و آفت ہ  
 گفت مشکوں عالم ناگاہ  
 جانیت ہاے من مصیبت ہ  
 میرزا غالب آن کہ از دہلی  
 نام او رشتہ در ولایت ہ  
 خود بہ جنت رسید و کرد عطا  
 بزمیج و شریف گفت ہ  
 وہ چہ غالب ہ ہر یکے غالب  
 روبروی او ز طیب نصرت ہ  
 اسد اللہ خان کہ نام دے است  
 تا چہا شیر کہ سلطنت ہ  
 چہ قصاص، چہ شہوی، چہ غزل  
 عربی از دے کھد خیالت ہ

لطف طبعش پہ عینا کہ در ہر شعر  
 بحفاظت کے حفاظت با  
 چوں بماندش اوج فصاحت  
 بندگان درش فصاحت با  
 چوں بماندش اوج فصاحت  
 بندگان درش فصاحت با  
 کم و جہاں در بلاغت با  
 لفظ و در لفظ آں معانی پاک  
 شعر و در شعر آں نزاکت با  
 علمی و در عالم دیگر  
 چہ ہمارے اندیش حقیقت با  
 شور ہر سو و لذت شعری  
 نمک خوانی او لطافت با  
 از عرافت چہ گویت، چہ نہاد  
 چہ غریبان و ہر منت با  
 حسن خلقت، چنان کزوی دید  
 کینہ در خرد ہم صحت با  
 آں قدم با کہ واقف از ہر فن  
 آں قدر آکر از طریقت با  
 ای کہ گوید کہ دہ مشرب بود  
 می قلوب از کرامت با  
 از مرآت نکات نامہ آکلوں  
 بآب و خرد با مرآت با

سمجھ او کسے کہ یک دم یافت  
 داندیش دل چہ یافت دولت ہا  
 او خداوند من ز پندری سال  
 من ثنا خواہی او ز مدت ہا  
 دو من و او ہ ہ پانی ختم  
 تا چہل سال ماند سمجھ ہا  
 دگر ایں را بیاں چہ سود کہ بار  
 ماند ہام دگر چہ الفت ہا  
 چہ نکیم چہ کلم از دے  
 ہ دل صاف و صدقہ شیع ہا  
 کردے قصوہ زہد اگر بھائی  
 چہ نمودے بمن نصحت ہا  
 چوں غزائند خلق خدوم  
 کردش چند سال خدمت ہا  
 جور ہا ظم ایں زباں ز سپر  
 ہام آں سر ہا و شفقت ہا  
 اے کہ پری، گزشت بر تو چہا  
 تا آکر ازین حقیقت ہا

لڑ مرنی و دھک طالبِ نرد  
 اسد اللہ خان غالبِ نرد

۴

ہاے آں مرد نامدار چہ شد  
 ہاے آں لڑ روزگار چہ شد



تا چہ سرسبز باغ و رنگیں گل  
 ہائے آں خوش گوا ہزار چہ شد  
 اعتبار است ایں زماں ہمہ خوار  
 ہائے آں صاحب اعتبار چہ شد  
 خار زار است گھٹن ہمہ دہر  
 ہائے آں غیرت بہار چہ شد  
 کریم و پرسم از کفارہ کشاں  
 ہائے آں عمر بے کفار چہ شد  
 کامکارے بہر در است گدا  
 ہائے آں شاہ کامگار چہ شد  
 گفت خود سانچہ دہی کام  
 ہائے آں سانچہ نگار چہ شد  
 جا چہ دیکھم خسرواں می داشت  
 ہائے آں ذوق شادوار چہ شد  
 یکہ آنکوں پناہ خواہم بلب  
 ہائے آں آئین حصار چہ شد  
 دیان خاک ترچش ستم است  
 ہائے آں قصر زرنگار چہ شد  
 گفت بود ایہ نمودیم صد سال  
 ہائے آں صوبہ استوار چہ شد  
 میرزا غالب، آنکہ بے کم و کیف  
 ہمہ را بود افکار چہ شد

شدنی اور ز دہر لازم ساخت  
 دینی نہ دایم دل نواز چہ شد  
 بود معصوم ازین دیار سخن  
 ہیں کہ بے از دینی دیار چہ شد  
 آں کہ بود از حشم نفوذ کہ بود  
 داس کہ از فقر داشت عار چہ شد  
 پاد زین میں کشیدم عہد ست  
 کر کشیدم جزا بار چہ شد  
 دل و چہیں الم چہ واقع گشت  
 من و امدو بے شمار چہ شد  
 کر اجل گشت روزی آیم  
 حاصلم غیر از انتظار چہ شد  
 آنچه اسال می شود عینا ست  
 چہ دہم شرح آگہ پار چہ شد  
 دانے کو کہ گیرش یک بار  
 در غفلت گر عدم غبار چہ شد  
 در ہلاک خودم کنوں مجبور  
 دایم ہر چہ اختیار چہ شد  
 آں گریہاں کہ دایم سالم  
 از چہ شد آہ ہر بار چہ شد  
 ایی میری اسے فغان کہ در غم ہو  
 چہ اجل چوں شدم دوچار چہ شد

شد ہر جملہ وہ لے کے پری  
 حاصل از ہر مستعار چہ شد  
 بعد ہر و قرار سونہی من  
 ہر آوارہ شد قرار چہ شد  
 آنکہ ہر دم یہ مستی سرشار  
 ہو آں گونہ ہوشیار چہ شد  
 آن کہ از قریب سید صافی ہا  
 ہم باغیاد ہو بار چہ شد  
 آں کہ ما صور حشر ہو قلم  
 حشر ہو ہا ہر روز چہ شد  
 مرگ چوں شد دوچار او دیلی؟  
 در کما و زیست کاردار چہ شد  
 اسے کہ پری چہ شد؟ دل کی جی  
 ہم ایسی لکھ جملہ کار چہ شد

فخر مرکی و رجب طالب نرد  
 اسد اللہ خان غالب نرد

چمن بیدار گرچہ باغ کرد  
 دھرتی شور و شر چہ باغ کرد  
 حال من شد ہر چہ باغ کرد  
 حال دل ہم دگر چہ باغ کرد  
 نقشہ ہر من و راز ہیست  
 دوجہں نظیر چہ باغ کرد

ای صدا خیزد از دلم که نکست  
 کوه انده کمر چه باغ کرد  
 در تلاشی دوا، چه باغ خرد  
 چاره درد سر چه باغ کرد  
 به چاک است دل، چه باغ گفت  
 به خوں شد جگر چه باغ کرد  
 مرد شعر و سخن، چه باغ خواند  
 رخت علم و هنر چه باغ کرد  
 نام نام آوری، چه باغ نمود  
 نرد آں نامور چه باغ کرد  
 به چاک است دل چه باغ کرد  
 به خوں شد جگر چه باغ کرد  
 دوسه امن و امان، چه باغ دیت  
 من و غضب بهر چه باغ کرد  
 نام از حد فزود، چه باغ زیست  
 عمر آمد بهر، چه باغ کرد  
 شمع از گریه آب ... ست  
 دین هر لحظه تر، چه باغ کرد  
 پنج زار مرا رسید از غیب  
 حزن داسه شرر چه باغ کرد  
 من دکان نایب بدم از سبک نفع  
 نفع من شد ضرر چه باغ کرد

من ہے گشتِ بوم از ہے امن  
 امن من شد خطرہ چہ ہائے کرد  
 گر یہ ام انچہ کرد کرد وگر  
 وہ سوسے ہام و وہ چہ ہائے کرد  
 غرضش تیر زد یہ دل گوئی  
 دغم دل کارگر چہ ہائے کرد  
 وہ تپش حال کر ہا آئے  
 ظم الا سے حذر چہ ہائے کرد  
 کر یکے رفت و دیگرے آمد  
 وہ از دل بند چہ ہائے کرد  
 چرخ و ایی مایہ بھیر ناچام  
 تانہ شد ہے اثر چہ ہائے کرد  
 اسے کہ گوئی دی مرد از غولیش  
 نیست صبر ایی قدر چہ ہائے کرد  
 مرغ دل را فلک چہ وہ تھا  
 رنعت دلتے کہ مگر چہ ہائے کرد  
 خاک شد خاک میرزا غالب  
 طیر خاکش چہ سزا چہ ہائے کرد  
 ہر کہ دقت باز کے آئے  
 صبر ہم گوئے مگر چہ ہائے کرد  
 آں کہ جز وہ حشر نہاد گئے  
 کرد از ایی جا سزا چہ ہائے کرد

آں کہ منی ماسم اور خوشے  
چوں گنگہ از نظر چہ باید کرد  
حالم ایں، نو خواب خوش و مود  
بے خبر را خبر چہ باید کرد  
دیم آخر ہر آں چہ خوش آمد  
چہ تھا و قدر چہ باید کرد  
حیرہ دلی، چراغ دلی کو  
سوسے دلی گز، چہ باید کرد  
چند کوئی تو د لعل تا چند  
قلعہ خامش رگ، چہ باید کرد

خبر مرئی و رجب غالب مرز  
اسد اللہ خان غالب مرز

۲

اسے خوشا او، خوشا نصیب او  
نزد لقا نہ فرد شہرت او  
خواند خود را مصاحب جبرئیل  
ہر کس شد نصیب صحبت او  
آں نگاہی کہ بود از منجھ  
کج اندوخت از فرسب او  
انہاں آسکہ است ازین کہ چہ کرد  
چہ نصیرا کوائے نصرت او  
شد دلے ہر کہ دید دیوانش  
از کلاش مہاں کرسب او

ہاں! کتنی گفیات ہو کہ جہاں  
 قدرت ہو جہاں ز قدرت ہو  
 رفعت ہو ز آسمان برتر  
 آسمان را حد ہے رفعت ہو  
 پارسا ہو خواہ خواہی رہد  
 من جہاں ہوو طرح ہو  
 کو نرسد بے کم ست جہو  
 کہ دیکھ بیکر و مدح ہو  
 کہ کفائی ست پہلوانی حق  
 وہو پایہ ہے نظم طالع ہو  
 حامیاں زو زیاد تر معلو  
 نہ ہے خاصاں ہمیں مرآت ہو  
 اسد اللہ خود ولی از دل  
 ہے علی بیشتر عجب ہو  
 شکر نظیر مش چہاں نہ کم  
 نصیحت از کس فکرت ہو  
 پیش من کا مقام من راج  
 طالع حق ہو اعجاز ہو  
 سمجھش ہو طالع کی بات  
 ہر کہ وہ ساری عجب ہو  
 وگر احمد بہشت پاسے وقت  
 روز عشر ہم از شام ہو  
 ہم خدا ہم رسول از راضی  
 تاکہ خوش دین ہو و طبع ہو

کینه تیزی بدین ابدانی  
 مهر و رزی خلق عادت او  
 باد گر کسی کجا سعادتمند  
 بود از نفسی خود عادت او  
 آسمان به زمین چرا نه قرار  
 چه جا بود وقت رحلت او  
 بسلامت سلام من کای خود  
 بود واپس سعادتمند او  
 عشق ازین هم رواست گر گویم  
 کم نه از وصل مرگ فرقت او  
 بادیم بود در طاقت و شعر  
 بادیم آمد چیا بدو او  
 بهر کم سواد و کم مایه  
 بود از حد زیاد شغف او  
 عاشقی از دوز مبرم یاد  
 انجمن بود یا که خلوت او  
 از من اکنون تمام ملک عشق  
 خسروی یافتم بدو او  
 نه از سائل دریغ تا چنان  
 جان حاتم فدای عشق او  
 ای گو کالبد شد طالع  
 سواد دم نقش یاد طبع او  
 فرض اکنون جزای چه حرف که خود  
 چه نه مبرم و درد فرقت او



غیر مرقی و رجب غالب مراد  
اسد اللہ خان غالب مراد

۵۰

غیر ازیں تا چه چیز او را یاد  
جمله اشیا و جمله اسما یاد  
سخن او چه عرش اظلا یاد  
از لب او بقل سبھا یاد  
رفت غالب مگر از جہاں من ہم  
روم از غولش بر چه بارہ یاد  
صحبت او نصیب رضواں را  
نقل ازیں مگر نہ کشت حالا یاد  
با لطیف آں کہ داشت لفظ نیز  
در پیشہ کھلدش جا یاد  
و الحمد آنجائے دل کش و دل خواہ  
بر چه دل خواہش میرا یاد  
عشوقہ دلبریں پندش بود  
ملوکہ حور روزے او را یاد  
راضی از دے پتاں کہ خطے بود  
ہم پتاں شاد حق تعالی یاد  
باثر یاد ایں دعا و ذکر  
از منش بر زباں قول یاد  
کشت بود او ہے صفا را  
دل با نیز ہے صفا یاد

حور باغ اگر ازو مستور  
 باشد ای هم دعا که رسوا باد  
 دانه هر یک بر آں که روشن بود  
 دود ما هم نبرد هویدا باد  
 هست آں جملہ معنی رنگیں  
 آں چه باقی بماند از ما باد  
 تا به خطبہ حسن شامی  
 چشم اہل زمانہ نہا باد  
 یارب آں دل کہ در غمش گدازست  
 چه دل ست او ترز خارا باد  
 مگر به غمخواریم اہل آید  
 نذر او جان ناکھیہا باد  
 در غمش ہر کہ ترک دنیا کرد  
 یارب او را ثواب عطا باد  
 قصیدہ طوف حرام او چه سکون  
 پا اگر بودم ز سرا پا باد  
 بر لب کوثر و لب حلیم  
 مرغوشی ہست او دد بالا باد  
 جز به بحث تواید او آسود  
 خانہ اعتقاد من آباد  
 در غمش خاک مستقیم و بر من  
 کس نہاورد رحم و باد

انچہ امروز کمرہ کار کمرہ  
 حاصلش از روز قریب ہا  
 من کہ دوم از دور مرا یارپ  
 سینہ صرا و دیوہ درط ہا  
 نعلب تو گر بہ زنی بہ گرفت  
 آہ من تقدہ عرش کا ہا  
 تو انم شجاعت مرگ از دست  
 در جن من بہاد جاں کا ہا  
 در فراق خان کا ساہ  
 مگر چہ عجزم کلیب عطا ہا  
 ہر چہ شکستہ بہ حق او آں ہا  
 از ثنی شہرہ تا ثنی ہا  
 بہ دیوان بہ فراب آکوں  
 نامہ ملک خن کہا آباد

نور مرآی و دھب طالب نرد  
 اسد اللہ خان طالب نرد



## حواشی

- ۱☆ "خطباتِ غالب"، سہ ماہی، ۱۳-۱۴، طبع، جلی، ۱۹۸۳ء، مرزا، بانکِ رام
- ۲☆ ایضاً، ص ۱۳۹
- ۳☆ "مکتوب سے پہلے"، طبع، کھانا، ۱۹۹۹ء، ص ۶۹
- ۴☆ "مکتوب"، سرہانی (غالب فہرست)، جنوری ۱۹۶۹ء، کراچی
- ۵☆ "دریغِ قہر"، "خطباتِ مرزا" ۱۳۹۷ء، ص ۴۷۹
- ۶☆ "مکتوب سے پہلے"، ص ۷۵
- ۷☆ ایضاً
- ۸☆ "پہاؤ دو دو" ("حقیق نامہ"، ص ۶۷)، مرزا، سید ذریعہ حسن آبادی، مطبوعہ پنجاب، جلی، دہلی، لاہور، ۱۹۷۰ء
- ۹☆ سرہانی پر ۱۹۷۷ء (۱۹۷۷ء) لکھا ہے، لیکن تقی نے کتاب کے بعد حسنہ و عقابیت پر درجوں کا سال طبع ۱۹۷۲ء لکھا ہے۔
- ۱۰☆ تصدیقات کے لیے "خطباتِ غالب" ملاحظہ ہو۔
- ۱۱☆ "مکتوب سے پہلے"، ص ۷۵
- ۱۲☆ "مکتوب سے پہلے"، ص ۸۱

## مقالات ممتاز

ممتاز دانشور ڈاکٹر ممتاز حسن کے مقالات کا مجموعہ

مرتبہ

شان الحق حقی

اردو ادب، عالمی ادب، تعلیم و ثقافت اور اقبالیات کے موضوع پر چھیالیس مقالات کا مجموعہ۔ اس میں قائد اعظم، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان، ملک اشعرا بہار اور بعض دیگر اکابر کے مختصر خاکے بھی شامل ہیں۔

○ صفحات ۴۷۲      ○ قیمت ایک سو پچاس روپے

ادارہ یادگار غالب

دوسری چورنگی۔ ناظم آباد

کراچی۔ ۱۹۶۰ء

# یادگار غالب

مولانا الطاف حسین حالی

”یادگار غالب“ اردو زبان کی زندہ جاوید کتابوں میں سے ہے۔ اس کا شمار اردو کے ادب عالیہ میں ہوتا ہے۔ غالب شاعری کا نقطہ آغاز بھی یہی ہے۔ یہ غالب پر پہلی جامع کتاب ہی نہیں، غالبیات کے موضوع پر اب تک لکھی گئی پیکڑوں کتابوں میں کل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا حالی، شاعری میں غالب کے شاعرانہ تھلورائن سے ذاتی تعلقات کی بنا پر ان کی سوانح عمری لکھنے کے برخلاف سے اہل تھے۔ لیکن یادگار غالب صرف سوانح عمری نہیں ہے، غالب کے اردو فارسی کلام نظم و نثر کا پیدا، مبسوط جائزہ بھی ہے۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۸۹۷ء میں جب غالب کی پیدائش کو پورے سو سال گزر چکے تھے، نامی پریس کانپور سے شائع ہوئی تھی۔ زیر نظر ایڈیشن اسی پہلے ایڈیشن کی نگی بازیافت ہے جو غالب کے دو صد سالہ یوم پیدائش پر شائع کیا گیا ہے۔ گویا یہ ”یادگار غالب“ کا بھی صدی ایڈیشن ہے۔

☆ صفحات: ۳۵۶ ☆ قیمت: دو سلاو پے

ادارۃ یادگار غالب

کراچی۔ ۱۹۷۰ء

# مآثر غالب

مرتبہ

قاضی عبدالودود

۱۲۰

صحیح و ترتیب شدہ

ڈاکٹر حنیف نقوی

ممتاز محقق قاضی عبدالودود کے غالب سے متعلق متعدد تحقیقی کاموں میں اس کتاب کو  
کل سرسید کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ کتاب پبل مرثہ و صحیحہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کے غالب نمبر میں بطور  
ضمیمہ شائع ہوئی تھی۔ یونیورسٹی میں شائع شدہ اور اعلیٰ کو اسی سال انجمن ترقی علوم، بہار نے حدود و حدود میں  
مکمل شکل میں شائع کیا تھا۔

اس کتاب میں غالب کی ہندو قہریلوں کو ایک ہاکر کے ان پر مالدار موافق قہریلوں کے لئے جو  
ہندو معلومات کا تحریک چھوڑ گئیں قاضی صاحب خود اپنے اس کام سے مطمئن نہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب و ضامینہ آؤ  
لے قاضی صاحب کے تمام تحقیقی کاموں کی اشاعت کے بعد گرام میں اس کتاب کو شامل کر کے ہونے اس کی  
ترتیب کا کام ممتاز محقق ڈاکٹر حنیف نقوی کے سپرد کیا جنہوں نے انتہائی دیر مدد دی ہے قاضی صاحب کے  
قہریلوں کو ہندو موافق پر مشتمل ہے اور سمجھاتے ہیں۔ یہ اپنے نکلنے والے میں ادارہ اشاعت ہے ہندو، ہندو کی طرف  
سے شائع ہوا۔

کتاب کا یہ نیا ایڈیشن شائع ہوا تو اندازہ ہوا کہ اسے مزید بہتر طرز پر نکلتا تھا۔ ڈاکٹر حنیف نقوی  
نے اپنے مرتبہ ایڈیشن پر نظر دانی کی اور یہ نظر دانی شدہ ایڈیشن ادارہ اشاعت غالب کی طرف سے شائع کیا گیا

۱۲۰

صفحات ۲۵۶

قیمت ایک سو پچاس روپے

لوگوں کو یاد رکھو غالب، کراچی

## غالب کی اردو نثر

اور

### دوسرے مضامین

مولانا حامد حسن قادری

مولانا حامد حسن قادری ہمارے ادب کا ایک بہت بڑا نام ہے۔ انھوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے، وہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ وہ ایک وقت بلند پایہ محقق، نقاد، ادبی مورخ، شاعر، تاریخ گو، مترجم اور مکتوب نگار تھے۔ ان کی ادبی یادگاروں میں ”داستانِ تاریخِ اردو“ اپنی نوعیت کی بے مثال کتاب ہے۔ اردو نثر کی یہ تاریخ بادشاہِ ادب کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

غالب بھی مولانا کی دلچسپی کا ایک خاص موضوع ہے۔ لیکن اس موضوع سے محققان کی تحریریں مختلف کتابوں اور رسالوں میں شغری ہوئی ہیں اور کبھی کتابی صورت میں یک جہتیں کی گئیں۔ ادارۂ یادگار غالب کی درخواست پر مولانا کے فرزند و اکابر خالد حسن قادری نے ان تحریروں کو مرتب فرمایا ہے اور یہ پہلی بار کتابی صورت میں شائع ہو رہی ہیں۔

☆ قیمت : ایک سو پچاس روپے

☆ صفحات : ۴۰۰

ادارۂ یادگار غالب

کراچی



ادارہ قیادگار غالب کی نئی سری کوئٹہ شفق بلی سٹریٹ

## تذکرۃ الشعراء

از

مولانا حسرت موہانی

مترجم

شفقت رضوی

دسویں صدی میں مولانا حسرت موہانی نے ہندوستان کی ادیب کا مزاج و ادب کوئی دوسرا نہیں  
گزارا انھوں نے ہندوستان کے قریب شاعروں کے کام کا انتخاب کیا جو متعدد جلدوں میں شائع ہو چکا  
ہے۔ اس کے ساتھ تذکرۃ الشعراء کی منصوبہ بندی جس کے تحت ہندوستان کے اہم شعراء کے حالات لکھے  
گئے۔ یہ حالات ان کے رسائل "مردوں" میں شائع ہوتے رہے۔ مولانا کا ہندوستان کا ان  
حالات پر مشتمل ایک تذکرۃ الشعراء شائع کر رہے ہیں مگر مولانا کی بنیادی مصروفیات کی وجہ سے یہ منصوبہ  
کچھ تکمیل دہا شعراء کے حالات پر محدود ہے۔ مطلقاً ان میں شائع ہوئے ہندوستانی ادیب دستاویز نہیں ہیں  
کیونکہ وہ مصنف ہندوستان کے کسی کتب خانے میں موجود ہے۔ مطلقاً مکمل ناکل نہیں ہے۔ مولانا  
حسرت خانہ شفقت رضوی نے ہندوستان کی مختلف علاقوں کے ہندوستانی مصنفین کو ایک جاکیا ہے اور ادیب  
یہ تذکرۃ الشعراء کی صورت میں شائع کیا ادیب کی دستاویز میں ہے۔

جلد ۱۸۹۲ ۱۸۹۲ء میں شائع ہے

ادارہ قیادگار غالب

۱۸۹۸ء میں شائع ہے

۱۸۹۸ء میں شائع ہے

## نواذیر غالب

اردو کے پہلی محققین میں ڈاکٹر اکبر حیدری کا کام معیار اور مظہار اردوؤں کے اعتبار سے مقامی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ گزشتہ چار دہائیوں سے جس طرح اردو زبان و ادب کے مختلف گوشوں پر دلو محقق و سہ ہے ہیں، اس کی مثالیں کم کم ملتی ہیں۔

غالب کے حوالے سے ڈاکٹر حیدری نے درجنوں مقالات لکھے ہیں جو مختلف علمی جریدوں میں شائع ہوئے ہیں یا تاحال غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کی افادیت کے قائل نظر اوار کا دھار غالب کی طرف سے ان سے درخواست کی گئی کہ وہ ان مقالات کو کتابی صورت میں یکجا کر دیں تو ان سے استفادے کا دائرہ وسیع ہو گا۔ اس گزارش کے جواب میں انھوں نے جو مضامین ارسال فرمائے، انھیں چند چھڑ قائل وہ مجموعوں کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

(۱) نواذیر غالب

(۲) غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے

ان دونوں مجموعوں میں حیات و آثار غالب اور معاصرین وہ جملہ شخصیات غالب کے بارے میں جو مطبوعات ملتی ہیں، اردو شاعری کی دوسری جگہ دستیاب ہوں۔ امید ہے اس دونوں کتابوں کی اشاعت سے غالب پر حق و کام کرنے کی راہ ہموار ہوگی۔

